ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور

۱۶/ ستمبر ۹۶ء

☆ کیا تبدیلی کی آندھیاں چلنے والی ہیں؟
☆ بری فوج اور پاک فضائیہ 'جنگ کو مزید طول دینے کے خلاف تھیں
☆ اب خلافت شخصی نہیں' اجتماعی ہوگی!

حدیث امروز

جنرل (ر) محمد حسین انصاری

خلفائے راشدین کا نظام

تین ہفتے گزرے ۱۷ اگست کے روز قومی اخبارات نے شہ سرخیوں کے ساتھ قائد حزب اختلاف و سابق وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف کا یہ بیان شائع کیا کہ "انکا عزم ہے کہ وہ بر سراقتدار آکر خلفائے راشدین کا نظام قائم کریں گے تاکہ عدل وانصاف کا بول بالا ہو اور لوگ خلیفہ حکومت سے پوچھ سکیں کہ آپ نے جو قمیص پہن رکھی ہے اس کا کپڑا کہاں سے آیا"۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب یہ واقعہ پہلی بار کسی کی زبان پر نہیں آیا۔ ہمارے ہاں مبلغین' اکابرین' دانشور اور سیاستدان اپنی تقاریر و تحریرات میں کبھی کبھار اس کا حوالہ دیتے ہی رہتے ہیں مگر شاید ہی کسی کا مقصد سبق لینا یا سبق دینا ہو' اکثر و بیشتر یہ حضرات اپنے موقف کو زینت بخشنے کیلئے داستان حق بیان کر دیتے ہیں جیساکہ میاں صاحب موصوف نے کوشش کی ہے۔ کاش میاں صاحب نے اپنی خوش نیتی کے ثبوت میں فریب زدہ عوام کو یہ بتا دیا ہوتا کہ انہوں نے اپنے گزشتہ دور حکومت میں خلفائے راشدین کے نظام کے نفاذ کی جانب کیا پیش قدمی کی تھی۔ اس وقت میاں صاحب وزیر اعظم ہونے کے علاوہ اسلامی جمہوری اتحاد کے قائد بھی تھے۔ جتنا اور جیسا قانونی اختیار انہیں تب پارلیمنٹ میں نصیب تھا وہ کسی اور کو تو کیا شاید انہیں بھی پھر کبھی ہاتھ نہ آئے۔ عوام یہ پوچھنے کے آج بھی حقدار ہیں کہ جس آئینی سقم کو میاں صاحب نے بے نظیر کے گزشتہ دور حکومت میں اپنی سیاسی مہم کی بنیاد بنایا تھا کہ اسلام میں عورت کی سربراہی جائز نہیں اس سقم کو انہوں نے قومی اسمبلی میں دو تہائی سے زائد اکثریت کے حامل ہوتے ہوئے دور کیوں نہ کیا؟ قول و فعل کا یہ تضاد! اور پھر بھی مستقبل میں بر سراقتدار آکر جناب عمر رضی اللہ عنہ کے عدل کی مماثلت جیسے عزم کے دعوے کی جسارت! ایسے ہی طرز عمل نے عوام کو مایوس کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب کوئی تحریک اٹھ کھڑی نہیں ہوتی خواہ نجات کے نام سے ہو یا ملک بچاؤ کہلاتی ہو' گھیراؤ کا پروگرام ہو یا دھرنے کا انداز' سیاسی پارٹی کی تجویز ہو یا دینی جماعت کا بلاوا۔ اب یہ کہہ کر عوام کو اکسا دینا آسان نہیں کہ مایوسی کفر ہے۔ ہاں! کفر ہے اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا' تاکہ بد عہد اکابرین کے عمل سے۔ نااہل قیادت سے مایوس ہونا بہتری نہیں لازم ہے' تاکہ اچھی قیادت تلاش کرنے کی ذمہ داری اجاگر ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔ اللہ رب العزت کا فرمان ہے "اے مسلمانو' اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ اپنی اجتماعی امانتیں (یعنی قومی سرداری کے منصب) ان لوگوں کے سپرد کیا کرو جو اہل ہوں (یعنی جو بد دیانت' کم ظرف' نااہل' بے اعتبار' اور بد عہد نہ ہوں)" سورۃ النساء' آیت ۵۸۔ بلاشبہ پاکستان کی موجودہ ابتر صورت حال کھاتے پیتے خوشحال لوگوں کے کرتوتوں کا نتیجہ ہے' تاہم عوام الناس اس کو تاہی کے مرتکب ضرور ہیں کہ انتخابات کے موقع پر پیسے' دھونس یا گروہ بندی سے مرعوب ہو کر حق اور باطل' صحیح اور غلط' نیکی اور بدی کی تمیز کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ اسی لئے یہ بیچارے حالات کی بے رحم چکی میں پستے رہے ہیں اور پستے چلے جائیں گے جب تک رائج الوقت سیاسی نظام کو خیرباد کہہ کر دنیا کی تاریخ کے مسلمہ روشن ترین زمانے یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور نبوت اور خلفائے راشدین کے دور خلافت کے نظام کو عملاً نافذ نہیں کیا جاتا۔ اس نظام کے خدوخال' اس کی تفصیلات اور اس کے فیوض و برکات تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہ کہہ کر پہلو تہی کر لینا مناسب نہیں کہ فی الوقت نظام خلافت کے داعی ڈاکٹر اسرار احمد ہیں۔ اپنی ہی زبان سے ہر جمعہ کے خطبے میں اس دور کی توصیف کا اقرار کرنے کے باوجود اس سے عملاً گریز کرنا کہاں کی دین داری ہے۔ چند روز ہوئے ایک صاحب نام عالم دین اور مبلغ اسلام شخصیت نے حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فوجی حکومت کے قیام کو ممکنہ حل کے طور پر تجویز کیا۔ ایسے میں انسان اپنے رب کے حضور ہی التجا کر سکتا ہے ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا۔

قیمت : ۸ روپے

الہدیٰ

ترجمانی : حافظ عاکف سعید

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

اور زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو' بلاشبہ یہ بڑی بے حیائی کا کام ہے اور بہت بری راہ ہے O

(کہ ارتکاب زنا تو دور کی بات ہے' محرکات زنا سے اجتناب بھی ضروری ہے' اور مطلوب تو یہ ہے کہ اس بے حیائی کے کام کی جانب جانے والے تمام راستوں کو مسدود کر دیا جائے اور دور دور تک بند شیں لگا دی جائیں۔ اسلام جن معاشرتی اقدار کو فروغ دینا چاہتا ہے ان میں نکاح کے راستے کو سہل بنانا اور زنا و بدکاری کو مشکل بلکہ ناممکن بنا دینا سر فہرست ہیں۔ ستر و حجاب کے احکام اور مرد و زن کے آزادانہ اختلاط کی ممانعت در حقیقت زنا کاری کی روک تھام ہی کے ذرائع ہیں کہ جس معاشرے میں یہ فعل بد راہ پا جائے اس کے افراد امن و سکون اور باہمی اعتماد کی دولت سے محروم و تہی دست ہو جاتے ہیں۔)

اور مت قتل کرو اس جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہو' مگر حق کے ساتھ'

(قتل ناحق کا شمار بھی شرک اور زنا کی مانند اکبر الکبائر میں ہوتا ہے کہ یہ جرم بھی بڑے بڑے پیمانے پر معاشرتی فساد اور بگاڑ کا باعث بنتا ہے۔ کسی ایک فرد کا خون بھی اگر ناحق بہایا گیا تو اس کے اثرات اس ایک شخص تک محدود نہیں رہتے' معاشرے کا ایک بڑا حصہ اس کے اثرات کی زد میں آتا ہے' اور جس معاشرے میں انسانی خون ارزاں ہو جائے وہاں خوف و دہشت کا دور دورہ ہوتا ہے اور امن و چین اور سکون و اطمینان تلاش کیے نہیں ملتے' ہاں اگر کوئی شخص ایسے جرم کا ارتکاب کرے جس کی سزا از روئے شریعت قتل ہو تو اس کا قتل کیا جانا معاشرے کے اجتماعی مفاد ہی میں ہو گا)

اور جو ناحق قتل کر دیا گیا تو اس کے ولی کو ہم نے ایک اختیار عطا فرما دیا ہے' پس وہ قتل کرنے میں زیادتی سے کام نہ لے' یقیناً اس معاملے میں اس کی مدد کی گئی ہے O

(کہ مقتول کے لواحقین کی دادرسی کا اس سے بہتر اور کوئی طریق ممکن نہیں جو دین و شریعت میں معین کر دیا گیا کہ انہیں یہ اختیار حاصل ہے کہ چاہیں تو بدلے میں قاتل کی جان لیں' چاہیں تو دیت اور ہرجانہ لے کر قاتل کی جان بخشی کر دیں اور چاہیں تو اسے غیر مشروط طور پر معاف کر دیں...... لیکن اگر مقتول کے ورثاء قاتل کی جان لینے ہی کا فیصلہ کر لیں تو انہیں یہ حق نہ ہو گا کہ قاتل کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کریں یا قاتل کے ساتھ ساتھ کسی بے گناہ کو بھی اس جرم میں ناحق ملوث کرنے کی کوشش کریں۔ اسلامی حکومت مقتول کے ورثاء و لواحقین کی اس حد تک مدد کرنے کی ضرور پابند ہے کہ قاتل کو پکڑ کر ان کے حوالے کر دے لیکن ورثاء کی جانب سے کسی زیادتی اور حق تلفی کو بھی اسلامی ریاست میں کسی طور پر گوارا نہیں کیا جائے گا)

(سورۃ بنی اسرائیل آیات ۳۳ تا ۳۴)

جوامع الکلم

کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہے مگر تین صورتوں میں : (۱) جان کے بدلے جان' (۲) شادی شدہ زانی (۳) اور دین کا ایسا ترک کرنے والا جو الجماعت سے علیحدہ ہو جائے

دین اسلام میں احترام جان کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ تاہم اجتماعی مفاد اور معاشرے کی اصلاح کے پیش نظر بعض سنگین جرائم کے مرتکب افراد کی جان لینا ناگزیر ہوتا ہے۔ از روئے فرمان نبویؐ (اسلامی ریاست میں حکومت کے زیر انتظام کسی مسلمان کو قتل کرنا صرف تین صورتوں میں جائز ہے۔ قاتل کو سزا کے طور پر قتل کیا جا سکتا ہے' شادی شدہ زانی کو شریعت اسلامی کی رو سے سنگسار کیا جائے گا اور اس مرتد کو بھی قتل کیا جائے گا جو ملت اسلامی سے کٹ جائے اور فتنہ و فساد کا باعث بنے...... اس کے علاوہ کسی صورت میں مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں)

(رواہ البخاریؒ و مسلمؒ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایڈیٹر کے ڈیسک سے!

کیا آج پورا پاکستان "ہارلم" نہیں بن چکا؟

"ہارلم" دنیا کے ایک نہایت ترقی یافتہ اور انتہائی مہذب ملک امریکہ کے مشہور زمانہ شہر نیویارک کا ایک "مشہور و معروف" محلہ ہے۔ یہ محلہ جرائم کا گڑھ اور لاقانونیت اور غنڈہ گردی کا بدترین گہوارہ سمجھا جاتا ہے اور یہی اس کی وجہ شہرت ہے۔ امریکہ میں مقیم ہمارے پاکستانی بھائی بتاتے ہیں کہ اس محلے سے گزرتے ہوئے ہر وقت ذہن و قلب پر یہ خدشہ مسلط رہتا ہے کہ ابھی کسی گلی کے کارنر سے کوئی سیاہ فام امریکی یا میکسیکن برآمد ہوگا اور گن پوائنٹ پر ہم سے نقدی اور گاڑی میں موجود دیگر قیمتی اشیاء چھین کر رفو چکر ہو جائے گا۔ وہاں سے گزرنے والوں کو بالعموم یہ تلقین کی جاتی ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ نقدی اپنی جیب میں ضرور رکھیں بصورت دیگر اندیشہ ہے کہ کوئی مسلح لٹیرا نقدی نہ پاکر طیش میں آجائے اور آپ کو شوٹ کر دے۔ مشہور ہے کہ نیویارک کی پولیس بھی ہارلم میں داخل ہونے سے گھبراتی ہے' بالخصوص سفید چمڑی والے پولیس والوں کے لئے یہ علاقہ قطعی غیر محفوظ سمجھا جاتا ہے۔ اپنے پاکستانی نژاد امریکی بھائیوں کی زبانی ہم یہ باتیں سنتے تو ہمیں شدید حیرت ہوتی کہ آخر لاقانونیت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے' اور پھر یہ سب کچھ امریکہ کے شہر نیویارک میں ہو رہا ہے!!!

لیکن آج مملکت خداداد پاکستان میں جب ہم اپنے گردوپیش نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں ہر طرف ہارلم کا سا نقشہ نظر آتا ہے۔ لاقانونیت' دہشت گردی اور غنڈہ گردی اپنے عروج کو پہنچی ہوئی ہیں۔ عدل و انصاف اور امن و امان کا کہیں دور دور تک نشان نہیں ملتا۔ گن پوائنٹ پر گاڑیاں' موٹر سائیکلیں اور زیورات و نقدی چھیننے کی وارداتیں اتنی بڑھ چکی ہیں کہ گھر سے اپنی سواری پر نکلنے والے ہر شخص کو خواہ وہ تنہا ہو یا اپنی فیملی کے ساتھ' ہر دم یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کسی جانب سے کوئی موٹر سائیکل یا گاڑی اچانک اس کا راستہ روکے گی اور چلتی سڑک پر دن دیہاڑے اسے گن پوائنٹ پر اپنی سواری اور تمام تر نقدی سے محروم کر دیا جائے گا۔ ستم یہ کہ پاکستان کے قلب لاہور میں اب ایسے روح فرسا واقعات بھی پیش آنے لگے ہیں کہ ایک گاڑی والے کو جو اپنی فیملی کے ساتھ لاہور کی ایک معروف سڑک وحدت روڈ پر جا رہا تھا' گن پوائنٹ پر روکنے کی کوشش کی گئی۔ اس شخص نے رکنے کی بجائے گاڑی تیز کر کے بھاگ نکلنے کی کوشش کی تو شکار کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر پیچھے سے اندھی فائرنگ کے ذریعے اسے موت کی نیند سلا دیا گیا۔ یہ واقعہ ہمارے ایک جاننے والے کے ساتھ پیش آیا۔ ایسے نہ معلوم کتنے واقعات روزانہ شہر لاہور میں ہوتے ہیں جن کی تفصیل اخبارات میں پڑھتے ہیں تو چکر آنے لگتا ہے۔ دکھ یہ ہے کہ اس قسم کے نوے فیصد واقعات کا سراغ لگانے میں ہماری پولیس بری طرح ناکام ثابت ہوتی ہے۔

پہلے پہل یہ صورت حال کراچی تک محدود تھی۔ لیکن اب پورا پاکستان بالخصوص لاہور بری طرح اس لاقانونیت اور دہشت گردی کے مہیب طوفان کی لپیٹ میں ہے۔ لاہور کی کوئی آبادی اور کوئی محلہ ایسا نہیں جہاں ہر روز ایسے متعدد واقعات پیش نہ آتے ہوں۔ ہمارے اپنے اڑوس پڑوس میں پچھلے ایک ہفتے عشرے کے دوران ڈکیتی اور دہشت گردی کے کئی واقعات پیش آچکے ہیں۔ چند روز قبل قرآن اکیڈمی سے چند قدم پر ریوالور سے مسلح ایک موٹر سائیکل سوار نے ایک کار کو روک کر اس میں سوار دو خواتین کو بندوق دکھا کر ان کے تمام زیورات اتروا لئے اور ان کے پرس چھین کر آناً فاناً غائب ہو گیا۔ حد یہ ہے کہ یہ واقعہ عین نصف النہار کے وقت چلتی سڑک پر اور بہت سے لوگوں کی موجودگی میں پیش آیا۔ ان خواتین کی رہائش گاہ جائے واردات سے چند قدم پر تھی لیکن کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچ سکا۔ ڈکیتی' قتل و غارت گری اور تشدد کے ان روز افزوں واقعات کے پیش نظر اخبارات میں اس قسم کے بیانات اب کھل کر شائع ہونے لگے ہیں کہ یہ ملک شرفاء کے رہنے کے قابل نہیں رہا۔ کچھ عرصہ قبل جب کراچی میں قتل و غارت گری اور بدامنی اپنے عروج پر تھی' بہت سے خاندان کراچی سے ہجرت کر کے لاہور میں جا آباد ہوئے تھے اور اب صورت یہ ہے کہ جس شخص کے پاس کچھ بھی وسائل موجود ہیں وہ ملک سے نکلنے بھاگنے کی فکر میں ہے۔

سورۃ النحل کی آیت ۱۱۲ میں بطور نشان عبرت ایک بستی کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو پورے طور پر آج ہماری صورت حال پر منطبق ہوتا ہے:

"اور (دیکھو) اللہ ایک بستی کی مثال بیان فرماتا ہے کہ وہاں کے لوگ امن و اطمینان سے تھے' ہر طرف سے بافراغت ان کا رزق ان کے پاس چلا آتا تھا' پھر انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے ان کو ان کے کرتوتوں کا یہ مزا چکھایا کہ بھوک اور خوف کو (ان کا) اوڑھنا (بچھونا) بنا دیا۔"

اللہ تعالیٰ نے مسلمانان پاکستان کو آج سے پچاس برس قبل ایک ایسا خطہ زمین عطا فرمایا جو ہر قسم کے وسائل سے مالا مال تھا اور جہاں امن و آشتی کا دور دورہ تھا۔ اللہ نے ان کے لئے رزق کے دروازے کھول دیئے۔ لیکن جب ہم نے بحیثیت قوم اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کی' یعنی بجائے اس کے کہ اس خطہ زمین کو اسلام کے نظام عدل اجتماعی کا ایک نمونہ بناتے' اللہ کے دین سے غداری اور اللہ اور اس کے رسول سے بے وفائی کے مرتکب ہوئے تو بطور سزا ہم پر بھوک اور خوف کا لبادہ اوڑھا دیا گیا۔ یہ سب کچھ ہمارے اپنے کرتوتوں کی پاداش میں ہوا۔ اس کی تلافی کی واحد صورت اب اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ ملک خداداد پاکستان میں اللہ کے دین کو غالب و سربلند کرنے کی یا باطاظ دیگر نظام خلافت کے قیام کی بھرپور سعی کا آغاز کر دیا جائے۔ جب تک ہماری ترجیح اول یہ نہیں ہوگی حالات سدھر نہیں سکیں گے۔ اللہ کی تائید و نصرت بھی ہمیں تبھی حاصل ہوگی جب ہم محمد مصطفےٰ ﷺ کے لائے ہوئے دین کو قائم و نافذ کرنے کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔ اصلاح احوال کی واحد ممکن صورت یہی ہے۔ اسے نظرانداز کر کے کچھ اور تجربات کرتے رہنا محض وقت کا ضیاع ہی نہیں اپنی منزل کھوٹی کرنے کے بھی مترادف ہے۔○○

تاخلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

○

تحریک خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ

ندائے خلافت

لاہور

بانی مدیر: اقتدار احمد مرحوم

جلد ۵ شمارہ ۳۵

۱۶ ستمبر ۹۶ء

19

ایڈیٹر

حافظ عاکف سعید

○

یکے از مطبوعات

تحریک خلافت پاکستان

۴۔ اے' مزنگ روڈ' لاہور

○

بتاریخ اشاعت

۳۶۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

فون: ۵۸۶۹۵۰۱-۳

○

پبلشر: محمد سعید اسعد طابع: رشید احمد چودھری

مطبع: مکتبہ جدید پریس' ریلوے روڈ' لاہور

○

قیمت فی پرچہ: ۸ روپے

سالانہ زرتعاون (اندرون پاکستان) ۱۵۰ روپے

○

زرتعاون برائے بیرون پاکستان

☆ ترکی' اومان' مصر ۱۳ امریکی ڈالر

☆ سعودی عرب' کویت' بحرین' قطر' عرب امارات' بھارت' بنگلہ دیش' یورپ' جاپان ۲۰ امریکی ڈالر

☆ امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ ۲۶ امریکی ڈالر

اب خلافت شخصی نہیں' اجتماعی ہوگی

مروجہ جمہوریت بھی اتنا ہی بڑا کفر و شرک ہے جتنا کسی انسان کی انفرادی حاکمیت

عہد حاضر میں خلافت کا نظام "امرھم شوری بینھم" کے اصول کے تحت استوار ہوگا

ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ آج بیسیوں ادارے معرض وجود میں آ چکے ہیں جو خلافت ہی کا نام لے رہے ہیں' ورنہ اب سے چند سال قبل تو خلافت کا نام تک لینے والا کوئی نہیں تھا۔ گویا مشیت ایزدی کا ظہور "زبان خلق" کی صورت میں ہو رہا ہے۔ لیکن خلافت کی عمومی مقبولیت کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ خلافت کی حقیقت کو سمجھا جائے اور عام کیا جائے' اس کی فلسفیانہ بنیادوں کو ذہنوں میں راسخ کیا جائے اور اس دور میں خلافت کے جو خدوخال ہیں ان کے شعور کو عام کیا جائے۔

بنیاد پرستی اور اجتہاد

خلافت راشدہ کو ختم ہوئے تو تیرہ سو برس بیت چکے ہیں۔ گویا وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ گیا ہے' بہت سے حالات تبدیل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ انہی بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر ہمارے دین میں "اجتہاد" کا باقاعدہ ادارہ رکھا گیا ہے تاکہ

"We can move with the movement of time"

تاہم اجتہاد کا مطلب Fundamentals سے روگردانی نہیں' ہمیں کسی معذرت کے بغیر ڈٹ کر کہنا چاہئے کہ ہم Fundamentalist ہیں' مگر اس اصطلاح کا ترجمہ "بنیاد پرست" غلط ہے۔ پرستش تو ہم اللہ کے سوا کسی کی نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم اپنی بنیادوں کو برقرار بھی رکھیں گے اور ان کا پرچار بھی کریں گے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ زمانہ کبھی رکتا نہیں ہے بلکہ وہ ارتقاء پذیر ہے۔

جو تھا نہیں ہے' جو ہے نہ ہوگا
یہی ہے اک حرف محرمانہ

اور واقعہ یہی ہے کہ

"ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں"

لہٰذا دیکھنا یہ ہے کہ اس بدلتے ہوئے زمانے کے چیلنج کا سامنا کرتے ہوئے خلافت کی شکل کیا ہوگی؟

میں اس Fundamentalism کی مثال قرآن سے لیا کرتا ہوں۔ قرآن حکیم میں کلمہ طیبہ کی مثال بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

﴿ الم تر کیف ضرب اللہ مثلا کلمہ طیبہ کشجرہ طیبہ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء ﴾

"کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کی مثال بیان کی' جیسے ایک پاکیزہ درخت جس کی جڑ مضبوط ہے اور جس کی شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں"۔

ظاہر ہے درخت اگرچہ صرف جڑ کا نام نہیں ہے۔ درخت میں تنا بھی ہے' شاخیں بھی۔ آخر برگ و بار شاخوں میں ہی لگیں گے نہ کہ جڑ کے ساتھ۔ اس کے باوجود جڑ کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ درخت کی جڑ کاٹ دیں تو وہ درخت ہی نہ رہے گا' وہ تو سوختنی لکڑی بن جائے گا۔ اس لئے ہمیں پہلے خلافت کے اصولوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ ان اصولوں کے بارے میں ہمیں کوئی compromise نہیں کرنا' بلکہ ان کو جوں کا توں برقرار رکھنا ہے۔ البتہ جہاں حالات متقاضی ہوں وہاں ان اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہاد کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔

خلافت کی حقیقت

یہ سوال کہ خلافت کیا ہے؟ اس کا مختصر ترین جواب یہ ہوگا کہ خلافت' حاکمیت کی ضد ہے۔ اسلام کے نزدیک حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے۔

سروری زیبا فقط اس "ذات بے ہمتا" کو ہے
حکمراں ہے اک وہی' باقی بتان آزری

چنانچہ اسلامی نقطہ نظر سے جو کوئی بھی اپنی حاکمیت کا مدعی ہوگا وہ گویا خدائی کا دعویدار ہے۔ فرعون کا دعویٰ بھی تو یہی تھا:

﴿ الیس لی ملک مصر وھذہ الانھار تجری من تحتی ﴾ (الزخرف : ۵۱)

"کیا مصر پر میری فرماں روائی نہیں؟ اور نہریں میرے زیر فرمان رواں نہیں؟"

نظام آبپاشی سارا میرے قبضے میں ہے' جس کو چاہوں دوں اور جس کو چاہوں محروم کر دوں۔ مصر کی ساری معیشت کا دارو مدار اسی "Irrigation system" پر تھا۔ اس لئے اس نے ﴿انا ربکم الاعلی﴾ کا نعرہ لگا دیا۔ نہ فرعون اتنا احمق تھا نہ اس کے ماننے والے اتنے جاہل تھے کہ وہ کائنات کا خالق ہونے کا دعویٰ کر بیٹھتا اور اس کی رعیت یہ دعویٰ کان دبا کر تسلیم کر لیتی۔ دراصل اس کا دعویٰ حاکمیت ہی کا دعویٰ تھا اور اسی دعویٰ کو خدائی کا دعویٰ قرار دیا گیا ہے۔

توحید کی اس اہم فرع کو اچھی طرح واضح کرنے کے لئے میں نے قرآن حکیم کے چار مقامات سے آیات منتخب کی ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے :

﴿ ولم یکن له شریک فی الملک ﴾ (بنی اسرائیل : ۱۱۱)

"حاکمیت میں اس کا شریک کوئی نہیں ہے"۔

سورۂ کہف میں فرمایا :

﴿ولا یشرک فی حکمه احدا﴾ (کہف : ۲۶)

"وہ اپنی حاکمیت میں کسی کو شریک نہیں کرتا"۔

سورۂ یوسف میں ہے :

﴿ ان الحکم الا لله امر الا تعبدوا الا ایاه ذالک الدین القیم﴾ (یوسف : ۴۰)

"نہیں ہے حکومت اور حاکمیت مگر صرف اللہ کی' اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو"۔

پھر سورۂ نور (آیت ۵۵) میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم کرنے کا جو منطقی نتیجہ نکلتا ہے یعنی انسانوں کی خلافت' اس کا ذکر اس طرح فرمایا گیا ہے :

﴿وعد الله الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنهم فی الارض﴾

"اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائیں اور عمل صالح کریں کہ وہ ان کو زمین پر ضرور خلیفہ بنائے گا"۔

مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے لئے حاکمیت نہیں' خلافت ہے۔ انسانوں کی حاکمیت' خواہ شخصی ہو یا اجتماعی' قرآن کی رو سے شرک ہے۔ جمہوریت کا اصول Popular Soversignty ہے۔ یہ بھی اتنا ہی بڑا کفر و شرک ہے جتنا کسی انسان کی انفرادی حاکمیت۔ فرعونیت' نمرودیت' اور عوامی حاکمیت میں نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ بقول اقبال ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

انسانی "حاکمیت" کا عقیدہ ایک نجاست ہے۔ اب خواہ نجاست کا منوں وزنی یہ ٹوکرا کسی ایک شخص کے سر پر رکھ دیا جائے یا تولہ تولہ ماشہ ماشہ کر کے اس نجاست کو جمہور پر تقسیم کر دیا جائے۔ شرک کا یہ نجس عقیدہ تقسیم کر دینے کے بعد بھی نجس کا نجس ہی رہے گا۔ توحید کا تقاضا تو یہ ہے کہ حاکمیت صرف اللہ کی ہے۔ اور جب حاکمیت اللہ کی ہے تو اب انسانوں کے لئے کیا رہ گیا؟ خلافت اور صرف خلافت [۲] چنانچہ خلافت اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا منطقی نتیجہ ہے۔

اس تصور کو سمجھنے کے لئے انگریزی دور حکمرانی کے وائسرائے کی مثال کو سامنے رکھئے۔ اس دور میں حاکمیت ملکہ برطانیہ یا شاہ برطانیہ کی تھی۔ دہلی میں ان کا وائسرائے ہوتا تھا۔ وائسرائے کا کام صرف یہ تھا کہ اصل حاکم کا جو حکم آ جائے اس کی تکمیل و تعمیل اور تنفیذ کرے۔ اسے کسی چون و چرا کی جرات نہ تھی' کیونکہ حاکمیت اس کی نہیں تھی۔ ہاں جن معاملات میں وہاں سے حکم نہ ملتا وہاں وہ حکمت اور حالات کے تقاضوں کو سمجھ کر اپنی صوابدید سے فیصلہ کر سکتا تھا۔ یہ vicegerency کا صحیح تصور ہے۔ بس فرق یہ تھا کہ اس کا حاکم ملکہ برطانیہ یا شاہ برطانیہ تھا جبکہ یہاں معاملہ شہنشاہ ارض و سماء کا ہے اور انسان کی حیثیت vicegerent کی ہے۔

خلافت کے سلسلہ میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خلافت پوری نوع انسانی کو عطا کی ہے۔ چنانچہ نوع انسانی کے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنایا گیا تھا۔ جیسا کہ ارشاد ہے :

﴿ واذ قال ربک للملائکه انی جاعل فی الارض خلیفه﴾ (البقرہ : ۳۰)

"اور (یاد کرو) جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا تھا بیشک میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمیت کو خلافت دے دی گئی' لیکن ---- (اور یہ لیکن بہت بڑا ہے) ---- نسل آدم میں سے جو خود مختاری کا دعوے دار بن کر بغاوت کی روش اختیار کر لے وہ باغی ہو گیا اور باغی کو زندہ رہنے کا بھی حق نہ ہونا چاہئے۔ تاہم اس کی کم سے کم یہ سزا تو بالکل منطقی ہے کہ اس کا حق خلافت سلب ہو جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر تو خلافت پوری نوع انسانی کو عطا کی تھی۔ لیکن اب انسانوں میں خلافت کے حقدار صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کر کے اس کے سامنے سر اطاعت خم کر دیں۔ ان کا یہ رویہ "اسلام" ہے اور وہ خود مسلم ہیں۔ اسلام کے معنی ہیں گردن نہادن (گردن جھکا دینا) یعنی to surrender یا to submit۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اب انسانی حاکمیت کے دعویدار بن گئے ہیں مسلمانوں کو ان کی سرکوبی کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے :

﴿ وقاتلوهم حتی لا تکون فتنه ویکون الدین کله لله﴾ (الانفال : ۳۹)

(مطلب یہ ہے کہ یہ باغی ہیں) "ان سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ و فساد فرو ہو جائے اور دین کل کا کل اللہ کے لئے ہو جائے"۔

جہاد و قتال کی توجیہہ یہی ہے اور اسی توجیہہ کی بنیاد پر یہ کڑوی گولی دور حاضر کا انسان اپنے حلق سے اتار سکتا ہے۔

تاہم جب تک مسلمان باغیوں کا فتنہ فرو کرنے کے قابل نہیں' اصولاً اس وقت بھی ان کا حق خلافت تو سلب ہو چکا ہے اور جائز طور پر خلافت اس وقت بھی صرف مسلمانوں کا حق ہے۔

تیسری بات یہ کہ جب تک نبوت کا سلسلہ جاری تھا اس وقت تک خلافت شخصی تھی۔ ایسا کیوں تھا؟ اس لئے کہ اللہ کا حکم ہر انسان کے پاس براہ راست نہیں آ رہا تھا۔ حاکم حقیقی تو آسمان پر تھا' ہر انسان سے اس کا براہ راست رابطہ نہ تھا' البتہ وحی یا Verbal Communication کے ذریعے صرف نبی کا رابطہ اصل حاکم سے قائم ہوتا تھا۔ احکام اسی کے پاس آتے تھے اور تنفیذ کا ذمہ دار بھی وہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت خلافت شخصی تھی۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام سے صیغہ واحد میں خطاب کر کے فرمایا گیا تھا:

﴿یاداود انا جعلنک خلیفہ فی الارض﴾

"اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے"۔

اس طرح ارشاد نہیں ہوا کہ "اے بنی اسرائیل ہم نے تم کو خلافت دی ہے" بلکہ خطاب ایک فرد معین سے ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مبارکہ سے بھی اس موضوع پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ فرمایا:

((کانت بنو اسرائیل تسوسہم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفہ نبی))

"بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء کے ہاتھ میں تھی' جیسے ہی ایک نبی کا انتقال ہوتا تھا ایک اور نبی اس کا جانشین ہو جاتا تھا"۔

چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کی وفات کے بعد نبوت بھی سلیمان علیہ السلام کو مل گئی اور خلافت بھی۔ پھر چودہ سو برس تک یہ سلسلہ ٹوٹا ہی نہیں۔ مگر ہمارے زمانے میں جب تک نبی اکرم ﷺ موجود تھے آپ ہی خلیفہ تھے۔ جب آنحضرت ﷺ کا انتقال ہو گیا تو آپ کے ساتھ وحی و نبوت کا سلسلہ تو ختم ہو گیا مگر خلافت کے نظام میں ایک بہت بڑا انقلاب آ گیا۔ چنانچہ اب خلافت شخصی نہیں اجتماعی ہو گئی۔ چنانچہ سورۂ نور کی آیت ۵۵ پر ایک بار پھر نظر ڈالئے

﴿وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنہم فی الارض.....﴾

یعنی "اللہ کا وعدہ ہے کہ (اے مسلمانو!) تم میں سے جو لوگ ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کر دیں گے ہم انہیں لازماً زمین میں خلافت عطا کریں گے"۔

دیکھئے یہاں واحد کی ضمیر نہیں ہے بلکہ جمع کی ضمیر ہے۔ گویا اب خلافت شخصی اور انفرادی کے بجائے اجتماعی بن چکی ہے۔

اب اس دور میں Social Evolution (معاشرتی ارتقاء) جس مقام پر پہنچ چکا ہے اس کے حوالے سے "حاکمیت" کا جائزہ بھی لینا ہو گا۔ معاشرتی ارتقاء کے تین stages ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب انسان صرف قبائلی اجتماعیت سے واقف تھا' قبیلے کا ایک سردار ہوا کرتا تھا۔ اب اگر وہ سردار یہ دعویٰ کرتا کہ میرے اختیارات مطلق ہیں' میں جو چاہوں حکم دوں تو گویا اس نے "حاکمیت" کا دعویٰ کیا جو کفر و شرک ہے۔ تاہم اگر وہ تسلیم کرے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں' اللہ کا حکم نافذ کروں گا تو اب اس کی حیثیت خلیفہ کی ہو گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہی پوزیشن تھی' وہ کہیں کے بادشاہ نہ تھے' بس ایک گھرانے کے سردار تھے' لیکن اللہ کے نبی تھے' اللہ کا حکم نافذ کرنے والے تھے۔ گویا وہ اپنے خاندان میں اللہ کے خلیفہ تھے۔

عمرانی ارتقاء کے اگلے مرحلے (stage) میں بڑی بڑی مملکتیں قائم ہو گئیں۔ ان سلطنتوں کے زمانے میں دور ملوکیت کا آغاز ہوا۔ یہ ملوک بھی دو قسم کے تھے۔ ایک طرف فرعون جیسے ملوک تھے جو اپنے اختیار مطلق کے دعویدار تھے۔ دوسری طرف داؤد علیہ السلام جیسے بادشاہ تھے۔ قرآن مجید میں آتا ہے "وجعلکم ملوکا" اور (اے بنی اسرائیل اس نے تم کو ملوک بنایا) گویا عمرانی ارتقاء کے اس مرحلے (stage) میں وہ بادشاہ تو ہیں لیکن معناً خلیفہ ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا جو حکم آ رہا ہے اس کو وہ خود بھی مان رہے ہیں اور اس کی تنفیذ بھی کر رہے ہیں۔

اور .... عمرانی ارتقاء کا اب آخری مرحلہ (stage) عوامی حاکمیت کا دور ہے۔ انسانوں میں اپنے حقوق کا شعور بیدار ہوا۔ ان کے ذہنوں میں سوالات ابھرنے لگے کہ ان کے اوپر انہی جیسا ایک انسان کیسے حکومت کر سکتا ہے۔ اس کے بھی دو ہی ہاتھ اور دو ہی پاؤں تو ہیں۔ یہ حکمرانی تو پوری انسانیت کا حق ہے جس پر ایک شخص قابض ہو گیا ہے مگر اس آخری ارتقاء کی منزل میں بھی حق و باطل کا معرکہ جاری ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شروع سے دو ہی چیزوں کے درمیان معرکہ آرائی رہی ہے' ایک طرف حاکمیت ہے دوسری طرف خلافت۔ گویا:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

البتہ یہ ضرور ہے کہ حاکمیت کی شکلیں مختلف ادوار میں مختلف رہی ہیں۔ حاکمیت اور خلافت کے ظاہری ڈھانچے بظاہر ایک جیسے ہوتے ہیں' ان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ کہنے کو فرعون و نمرود بھی بادشاہ ہیں اور داؤد و سلیمان بھی بادشاہ۔ لیکن نمرود اور فرعون درحقیقت خدائی کے دعویدار ہیں لہٰذا مشرک اور کافر ہیں جبکہ داؤد اور سلیمان ظاہری اعتبار سے تو بادشاہ ہیں لیکن حقیقت میں خلیفہ ہیں۔ بعینہٖ یہی پوزیشن آج کے عہد میں ہے۔

علامہ اقبال نے یہ بات اپنی زندگی کی آخری نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں بیان کی ہے۔ اس نظم میں علامہ اقبال کے عمرانی فکر (social thoughts) کا خلاصہ آ گیا ہے۔ چنانچہ اس نظم میں ابلیس کا ایک

مشیر کہتا ہے : "جمہوریت کا دور آگیا ہے' ہمیں اس سے بڑا اندیشہ ہے۔ گویا ہماری شیطنت کو چیلنج کرنے کے لئے انسان جاگ اٹھا ہے"۔ دوسرا مشیر کہتا ہے کہ "تمہیں خواہ مخواہ کی تشویش ہو گئی ہے۔ ارے ؎

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خودشناس و خودنگر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر"

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور کی جمہوریت دراصل سرمایہ داروں کی آمریت (Dictatorship of the Capitalists) ہے۔ امریکہ کے نظام کو جو لوگ جمہوریت سمجھے بیٹھے ہیں ان کی دماغی صحت یقیناً مشکوک ہے بقول اقبال ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

امریکہ میں الیکشن لڑنے کے لئے Millionare نہیں Billionare ہونا ضروری ہے۔ بیچارے عام آدمی کے ہاتھ میں تو صرف ووٹ کی پرچی ہے' جس نے اسے پاگل بنا دیا ہے۔ یہی پرچی ہمارے ہاں بھی عام آدمی کے ہاتھ میں آگئی ہے' مگر پس پردہ کھیل وہاں سرمایہ داروں کا ہے یہاں جاگیرداروں کا ہے۔ جمہوریت تو تب ہو گی جب عوام کے اندر معاشی انصاف قائم ہو جائے۔ اس معاشی انصاف کے بعد ان کے ہاتھ میں پرچی دے کر دیکھئے۔ اب وہ خود فیصلے کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے کہ اس پرچی کو وہ کس کے لئے استعمال کریں۔

ایک طرف عمرانی ارتقاء کے نتیجے میں شیطان نے انسانی حاکمیت کے تصور کو اجتماعی حاکمیت (Popular Sovereignty) کی شکل دے دی ہے تاکہ اس کی شیطنت برقرار رہے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے بھی انسانی خلافت کو شخصی خلافت سے ہٹا کر اجتماعی خلافت میں بدل دیا ہے۔ یہ معاملہ ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ حاکمیت اور خلافت کی جنگ مسلسل جاری ہے۔ عہد حاضر کی خلافت "عوامی خلافت" ہے۔ حضرت عمرؓ کے بقول خلافت "امرالمسلمین" ہے۔ یہ مسلمانوں کا ایک اجتماعی ادارہ ہے۔ قرآن مجید میں اس فلسفہ کو سورۂ شوریٰ میں ان الفاظ کے ذریعے واضح کیا گیا ہے ﴿وامرھم شوریٰ بینھم﴾ اس سے یہی مراد ہے کہ مسلمانوں کا "امر" مسلمانوں کی باہمی مشاورت سے طے پائے گا۔

اس وقت بھی ہر انسان اپنی جگہ خلیفہ ہے مگر کس معنی میں؟ اس معنی میں کہ میرا یہ جسم میرے پاس اللہ کی امانت ہے۔ میں اس کے استعمال میں اللہ کا خلیفہ ہوں تاکہ اس جسم پر اللہ کا حکم نافذ کروں اور جسم میں جو صلاحیتیں ودیعت ہیں انہیں اس کی مرضی کے مطابق صرف کروں۔ اس جسم کو وہی دوں جو اللہ نے اس کے لئے حلال ٹھہرایا ہے۔ اگر میں یہ روش اختیار کروں تو خلیفہ ہوں۔ اس کے برعکس اگر میں یہ کہوں کہ اپنے جسم سے اپنی مرضی کے مطابق کام لوں گا تو میں گویا خدائی کا دعویدار ہوں' حاکمیت کا مدعی ہوں۔ چنانچہ سورۃ الحدید میں آیا ہے :

﴿ امنوا باللہ ورسولہ وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ﴾

"یعنی ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور کھپا دو ان تمام چیزوں کو اللہ کے راستے میں جن میں اس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے"۔

بقول حضرت شیخ سعدی ؎

ایں امانت چند روزہ نزد ماست
در حقیقت مالک ہر شے خداست

(یہ جو کچھ میرے پاس ہے چند روزہ امانت ہے (ورنہ) ہر چیز کا مالک تو در حقیقت اللہ تعالیٰ ہے۔)

یہ ہاتھ میری ملکیت نہیں ہیں بلکہ اللہ کی عطا کردہ امانت ہیں۔ میرا پورا وجود اور پھر جو کچھ مزید مال واولاد کی شکل میں دیا گیا ہے سب اللہ کی امانت ہے۔ اس لئے پہلے خلافت اپنے وجود میں' اس کے بعد اپنے اس گھر میں جس کے آپ سربراہ ہیں' خلافت کا حق ادا کریں۔ لیکن اگر آپ نے اپنے گھروں میں اللہ کے حکم کے بجائے کسی اور کا حکم چلانا شروع کر دیا ہے تو اس صورت میں آپ خلیفہ نہیں' باغی ہیں۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ خلافت کی اجتماعی شکل کیا ہو گی۔ اجتماعی نظام کیسے بنانا ہو گا؟ اس کو اس بات پر قیاس کیجئے کہ اجتماعی حاکمیت کا نظام کیسے بنایا گیا ہے۔ پاکستان میں اس وقت گیارہ کروڑ آدمی بستے ہیں تو کیا گیارہ کروڑ حاکم ہو گئے؟ اگر یہ صورت ہے تو گاڑی کیسے چلے گی؟ "تو بھی رانی' میں بھی رانی کون بھرے گا پانی" عوامی حاکمیت کا مطلب تو یہی ہے۔ لیکن یہ دیکھئے کہ نظام کیسے بنایا گیا؟ نظام بنانے اور چلانے کے لئے ووٹ کی ایک پرچی دے کر آپ اپنی حاکمیت کو منتقل کر دیتے ہیں۔ میں رائے کا اظہار ایک شخص کے حق میں کر رہا ہوں' آپ کسی دوسرے شخص کے حق میں کر رہے ہیں۔ یہ شخص حاکمیت کا حق ووٹ کے ذریعے ان لوگوں کو تفویض کر دیتا ہے جو منتخب ہو کر اسمبلی میں پہنچ گئے۔ اگر صدارتی نظام ہے تو یہ اختیار صدر کو منتقل ہو جائے گا۔ گویا ملک کے عوام کی اکثریت نے اپنی حاکمیت اسے منتقل کر دی ہے۔ بعینہٖ یہی معاملہ ﴿امرھم شوریٰ بینھم﴾ میں بھی ہو گا۔ میں بھی اللہ کا خلیفہ ہوں' آپ بھی اللہ کے خلیفہ ہیں' اس لئے کہ خلافت اجتماعی ہے۔ اب اجتماعی نظام بنانے کیلئے کسی اصول کو اختیار کرنا پڑے گا۔ لوگ اپنی "خلافت" کسی ایک شخص کو منتقل کریں گے جو "خلیفۃ المسلمین" کہلائے گا۔ تمام مسلمانوں کے پاس جو حق خلافت تھا اس حق کو ان کی عظیم اکثریت نے اس شخص کو منتقل کر دیا' اس معنی میں وہ خلیفۃ المسلمین ہے۔

خلفاء راشدین کے لئے امیرالمومنین کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی لیکن

(باقی صفحہ ۹ پر)

ریاست کے نئے وزیر اعلیٰ فاروق عبداللہ ہوں گے؟

حالیہ امریکی اقدامات کو بے نظیر حکومت کی خاموش تائید حاصل ہے

سردار اعوان

یہ شمارہ جب تک قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے گا کشمیر میں انتخابات کی صورت حال بہت حد تک سامنے آ چکی ہو گی' تاہم قارئین بجاطور پر یہ محسوس کریں گے کہ ان انتخابات کے پس منظر کو سمجھنے کے ضمن میں یہ مضمون وسیع افادیت کا حامل ہے۔ (ادارہ)

مشہور عالمی جریدے "سنڈے" میں حال ہی میں سرینگر سے جناب رشید احمد کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے امریکی صدر کلنٹن کے دو قریبی ساتھیوں' ہندوستان میں متعین امریکی سفیر فرنیک وزنر اور سینٹر ہینک براؤن کے انتخابات سے ایک ماہ قبل کشمیر کے دورے کے حوالے سے بعض قیاس آرائیوں کا تذکرہ کیا ہے اس کے علاوہ "انڈیا ٹو ڈے" میں سرینگر سے ہی ہریندر بویجا نے کشمیر میں اس ماہ ہونے والے انتخابات میں شامل سیاسی جماعتوں کی صورت حال کا جائزہ لیا ہے۔ ان مضامین سے کشمیر میں رونما ہونے والی حالیہ تبدیلیوں کا پتہ چلتا ہے۔

امریکیوں کے اس دورہ کشمیر کو "غیر معمولی" قرار دیتے ہوئے اس امر کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ اس وقت کشمیر کا مسئلہ امریکی انتظامیہ کے ایجنڈے میں چوٹی پر ہے۔ سیاسی مبصرین کی رائے میں اس کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں۔ مثلاً امریکہ کے شدید دباؤ کے باوجود ہندوستان کا CTBT پر یہ کہہ کر دستخط کرنے سے انکار کر دینا کہ یہ معاہدہ اپنی موجودہ شکل میں اقوام عالم کے درمیان "امتیازی" سلوک کا حامل ہے' امریکہ کے لئے ناگواری کا باعث بنا ہو گا لہٰذا وہ کشمیر کارڈ کو ہندوستان کے خلاف "دھمکی" کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔

کشمیر کے مسئلے پر امریکی رویے میں تیزی کی وجہ اس سال کے آخر میں امریکہ کے اپنے صدارتی انتخابات بھی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ صدر کلنٹن اگلی مدت کے لئے اپنا موجودہ عہدہ برقرار رکھنے کے لئے عالمی سیاست میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام دینے کی تلاش میں ہوں۔

یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ امریکہ کو واقعی یہ احساس ہو گیا ہو کہ کشمیر کے مسئلے کا حل ضروری ہے کیونکہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایٹمی جنگ کا خطرہ موجود رہنے سے عالمی امن اور استحکام کو یقینی نہیں بنایا جا سکتا۔ خاص کر چین کو سپر پاور بننے سے روکنے کے لئے اس خطے میں امن قائم ہونا ضروری ہے۔

اگرچہ امریکہ کی طرف سے کشمیر کے مسئلے کے حل کے لئے کوئی باقاعدہ تجویز تو سامنے نہیں آئی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اندر ہی اندر کسی فارمولے پر تیزی سے کام ہو رہا ہے۔ بہ ظاہر امریکہ اقوام متحدہ کی قرار دادوں یا شملہ معاہدے سے الگ رہتے ہوئے اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کرنا چاہتا ہے جیسا کہ ایک اعلیٰ امریکی عہدیدار کا کہنا بھی ہے کہ "کشمیر کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے تاریخ سے کوئی مدد ملنا مشکل ہو گئی"۔ غالباً ہندوستان اور پاکستان کو کشمیر کا مسئلہ سردست بھول کر کیمپ ڈیوڈ طرح کا کوئی معاہدہ کر لینے کا کہا جائے گا جس میں بعض آئینی اور بین الاقوامی یقین دہانیوں کے ذریعے کشمیریوں کو اپنی مرضی کی حکومت بنانے کا حق دیا جائے گا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ امریکہ کے اس اقدام کے روح رواں فرینک وزنر ہیں جو کشمیر میں انتخابات کے صرف حامی ہی نہیں' آل پارٹی حریت کانفرنس (APHC) کو بھی ان انتخابات میں حصہ لینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ البتہ ان کا واضح طور یہ کہنا ہے کہ محض انتخابات سے کشمیر کا جھگڑا ختم نہیں ہو گا بلکہ انتخابات اس جھگڑے کو ختم کرنے کا ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

ادھر کشمیر میں علیحدگی پسند گروہ' جو وادی میں مجوزہ انتخابات کی مخالفت کر رہے ہیں' وزنر کے اس موقف سے سخت نالاں ہیں۔ اگست کے پہلے ہفتے وزنر جب ان سے ملاقات کرنے کے لئے آئے تو ان کی ناراضگی ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ APHC کے لیڈروں نے امریکی سفیر سے نہ صرف ملنے سے انکار کر دیا بلکہ ان کی وہاں موجودگی پر شدید نکتہ چینی کی۔ اور ہینک براؤن کے پاس باقاعدہ اپنا سخت احتجاج رجسٹر کرایا جس میں کہا گیا تھا کہ "ہمارے بارے میں کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ ہم پر کوئی حل ٹھونسا جا سکتا ہے۔"

یہ بات بہرحال یقینی ہے کہ حال ہی میں کشمیر کے بارے میں امریکہ کی پالیسی میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ جو غالباً پاکستان کے اپنے موقف میں تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ باخبر ذرائع کا کہنا ہے کہ حالیہ امریکی اقدامات کو بے نظیر حکومت کی خاموش تائید حاصل ہے۔

پاکستان کے موقف میں اس تبدیلی کے بارے میں APHC کے اہم راہنماؤں کا خیال ہے کہ پاکستان اور ہندوستان نے خفیہ طور پر کراچی اور کشمیر میں ایک دوسرے کے معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرنے کا طے کر لیا ہے۔ اور غالباً عنقریب بے نظیر حکومت کشمیری مجاہدین کو پاکستان میں مظفر آباد کے اردگرد سے چلے جانے کا کہہ دے گی۔

اگرچہ ہندوستانی حکومت حالیہ تبدیلیوں کے بارے میں زیادہ خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہے کیونکہ اسے احساس ہے کہ اسلام آباد کی کوئی بھی حکومت اس مسئلے پر لچک دکھا کر اقتدار سے محروم ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی اس کے باوجود وہ حالیہ پیش رفت سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی سرتوڑ کوشش کر رہی ہے۔ ہندوستانی وزیر اعظم شاید یہ سمجھتے ہیں کہ کشمیر کے مسئلے کو حل کرنے کا اس سے بہتر موقعہ ہاتھ نہیں آئے گا اور اگر وہ یہ مسئلہ حل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اسے یونائٹڈ فرنٹ حکومت کی بہت بڑی سیاسی کامیابی تصور کیا جائے گا۔ چنانچہ ہندوستانی الیکشن کمیشن کی طرف سے ستمبر میں کشمیر میں انتخابات کے انعقاد کے اعلان کے ساتھ ہی دیو گوڑا حکومت نے کشمیر کے لئے ایک معاشی پیکج کا اعلان کر کے کشمیریوں کے دل جیتنے کی کوشش کی ہے۔

انتخابات میں شامل جماعتوں کے حوالے سے اس بات کا قوی امکان ظاہر کیا گیا ہے کہ ریاست کے نئے وزیر اعلیٰ فاروق عبداللہ ہوں گے۔ ۹ سال کے خون آشام تعطل کے بعد یہ انتخابات ایسے ماحول میں ہو رہے ہیں کہ پوری وادی جنگ کے زخموں سے چور ہے۔ لوگ امن اور ترقی جیسے الفاظ سے نامانوس ہو چکے ہیں۔

۱۹۸۷ء کے انتخابات میں جن میں کہا جاتا ہے زبردست دھاندلی کی گئی تھی' فاروق عبداللہ کو شکست ہوئی تھی لیکن اس وقت وہ سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ انہیں اپنی اہمیت کا بخوبی علم ہے کیونکہ مجاہدین اور APHC کی طرف سے موجودہ انتخابات کی مخالفت اور بائیکاٹ کے بعد صرف ان کی نیشنل کانفرنس کی شرکت ہی ان انتخابات کو جواز فراہم کر سکتی ہے۔

صرف ۶ ماہ قبل تک فاروق عبداللہ کو وادی میں سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن اس وقت لوگوں کے سر سے پاکستان کا جادو اتر رہا ہے' حریت کی قیادت کوئی نمایاں کارکردگی پیش کرنے سے قاصر نظر آتی ہے مجاہدین کی تحریک کمزور پڑنے لگی ہے مزید برآں لوگ مسلسل ہڑتالوں' بموں کے دھماکوں اور گولی چلنے کی وارداتوں سے عاجز آ چکے ہیں' انہیں عبداللہ کے علاوہ اس وقت کوئی دوسرا راستہ نظر بھی نہیں آتا' خاص کر جب اسے وزیر اعظم ایچ۔ ڈی دیو گوڑا کی یہ یقین دہانی بھی حاصل ہو کہ صرف وادی ہی نہیں' جموں اور لداخ میں بھی عوام کی خواہشات پوری کی جائیں گی۔

لگ بھگ تین ماہ قبل عبداللہ کی نیشنل کانفرنس نے لوک سبھا کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا اس کے علاوہ سابق وزیر اعظم کا Burkina Faso پیکج بھی رد کر دیا تھا جس سے عبداللہ کی سیاسی ساکھ پھر سے قائم ہو گئی ہے۔ کشمیر میں NC واحد جماعت ہے جس کے پاس نچلی سطح تک کارکن موجود ہیں اور عبداللہ کو امید ہے کہ وہ تبدیلی کی ان لہروں کو اپنے حق میں استعمال کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ "پوری ریاست کے لئے خود مختاری اور امن" کے نعرہ کے ساتھ انتخابات میں شمولیت نے عبداللہ کو سب کے لئے قابل قبول بنا دیا ہے' لہٰذا آج وہ کانگرس کے صدر سے ملنے نئی دہلی جا رہے ہوتے ہیں اور اگلے روز واپس سرینگر میں جنتا دل (JD) کے لیڈروں کے ساتھ بات چیت کر رہے ہوتے ہیں۔

NC نے شروع میں ہی کسی بھی قومی جماعت کے ساتھ اتحاد کے امکان کو رد کر دیا ہے۔ جیسا کہ ایک لیڈر نے کہا ہے "اکیلے رہ کر کشمیریات کا تصور ابھرے گا اور کسی کو یہ اعتراض کرنے کا موقعہ نہیں ملے گا کہ انہوں نے کسی حکومتی جماعت کے ساتھ ساز باز کر لی ہے۔" چونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ۱۹۸۷ء میں راجیو گاندھی کے ساتھ اتحاد قائم کر کے انہوں نے سنگین غلطی کی تھی اس لئے اب وہ JD' BSP اور CPI جیسی جماعتوں کے ساتھ' جن کی ریاست میں برائے نام موجودگی ہے سرسری قسم کا انتخابی سمجھوتہ کرنا چاہتے ہیں۔

ادھر کانگرس بھی NC کے ساتھ کسی سمجھوتے کی منتظر ہے کیونکہ اسے اپنی کامیابی مشکوک نظر آ رہی ہے۔ اس مقصد کے تحت مفتی سعید JD چھوڑ کر کانگرس میں شامل ہو چکے ہیں۔ اگرچہ کانگرس نے وادی کی لوک سبھا کی تین میں سے دو اور ۶ ریاستی سیٹوں میں سے ۴ سیٹیں حاصل کر لی تھیں مگر اس کی وجہ یہ تھی کہ NC نے لوک سبھا کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا۔ اب اگر راؤ' عبداللہ بات چیت کامیاب رہی تو NC کا اصلی مقابلہ BJP کے ساتھ ہوگا۔ BJP نے پنڈتوں کے وادی سے چلے جانے کے بعد اپنا ایک ووٹ بنک قائم کر لیا ہے۔ جموں اور وادی کے کچھ حصوں میں لگ بھگ نصف درجن سیٹوں پر مہاجر پنڈت اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

اس دوران حریت نے انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کرنے کے بعد مظاہرے شروع کر دیئے ہیں۔ JKLF کے راہنما یسین ملک گھر گھر جا کر لوگوں کو ووٹ نہ ڈالنے کی اپیل کر رہے ہیں۔ حریت کو اس بات کا احساس ہے کہ اگر اس کی اپیلوں پر کان نہ دھرا گیا تو انتخابات کے بعد وہ بے اثر ہو کر رہ جائے گی۔

انتظامیہ کو جو سب سے بڑا چیلنج درپیش ہے وہ وادی اور جموں میں تشدد سے پاک انتخابات کرانے کا ہے۔ مجاہدین کی کارروائیاں روکنے کے لئے انتخابی پروگرام آگے پیچھے چار مرحلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود 300 سے اوپر امیدواروں کو ذاتی تحفظ فراہم کرنا آسان کام نہیں ہوگا۔

عبداللہ کو اقتدار سے علیحدہ ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزارا کہ دوبارہ اقتدار میں آنے کے واضح امکانات دکھائی دینے لگے ہیں اس لئے ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہو گا مگر ان کا اصل امتحان اقتدار میں آنے کے بعد شروع ہو گا جب مرکزی حکومت کے بجائے وہ جواب دہ ہوں گے۔ انہیں مجاہدین کے علاوہ ان تمام لوگوں کو مطمئن کرنا پڑے گا جنہوں نے "کشمیریات" کے وعدے پر امن کے لئے موقعہ فراہم کیا ہے۔

عبداللہ کا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ امن کے لئے خود مختاری ناگزیر ہے۔ اور بلاشبہ ان کی اولین ترجیح بھی یہی ہو گی مگر اس کے لئے انہیں شدید جنگ لڑنی ہو گی۔ OO

بقیہ : خطبات خلافت

خلافت عثمانیہ تک پہنچتے پہنچتے اصطلاح بدل گئی۔ اب ان خلفاء کے لئے امیر المومنین کی اصطلاح استعمال نہیں ہوتی۔ ان کے لئے خلیفہ المسلمین کی اصطلاح استعمال ہونے لگی۔ یہ اصطلاح بالکل صحیح ہے۔ ظاہر بات ہے کہ عہد حاضر میں جو خلافت بنے گی وہ "امرھم شوری بینھم" کے اصول کے تحت ہی بنے گی۔ مسلمانوں کے نزدیک جو شخص اہل ہے وہ اسے اپنا ووٹ دیں گے۔ ان کی اس رائے سے خلیفہ المسلمین منتخب ہو گا۔ اور اس طرح اجتماعی نظام وجود میں آ جائے گا۔ (جاری ہے)

حواشی

{۱} اسی کی خوبصورت تعبیر علامہ اقبال نے یوں کی ہے ~

سروری زیبا فقط اس "ذات بے ہمتا" کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آزری

{۲} یا پھر بغاوت

ایوب خان کی صدر جانسن سے اپیل نہایت حیرت کا باعث تھی

بری فوج اور پاک فضائیہ 'جنگ کو مزید طول دینے کے خلاف تھیں

چون این لائی نے کہا : عددی قوت کی برتری عوام کے عزم کو مسخر نہیں کر سکتی

لفظی شعبدہ بازی کے باوصف جنگ بندی کے اعلان پر مشتمل ایوب خان کی تقریر عوام کے لئے مایوسی کا پیغام ثابت ہوئی

یہ واضح ہو چکا تھا کہ اگر پاکستان چین کی مکمل حمایت چاہتا ہے تو اسے ایک طویل جنگ کے لئے تیار ہونا پڑے گا

زیر نظر مضمون جناب الطاف گوہر نے لکھا ہے۔ الطاف گوہر صدر ایوب خان کے دور میں مرکزی سیکرٹری اطلاعات کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ انہیں صدر ایوب کے قریب رہنے اور اہم معاملات میں مشورے دینے کا موقع ملا۔ جنگ ستمبر کے حوالے سے الطاف گوہر کی ذاتی معلومات اور مشاہدے کو بلاشبہ اہمیت حاصل ہے۔ ہفت روزہ "زندگی" میں شائع ہونے والے اس مضمون کی اہمیت کے پیش نظر "ندائے خلافت" کے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

پاکستان پر بھارتی حملے نے ایوب خان کو ششدر کر دیا۔ ان کی پریشانی میں پاک فوج کے کمانڈر انچیف جنرل موسیٰ بھی شریک تھے۔ بھٹو اور عزیز احمد دونوں منقار زیر پر کئے بیٹھے تھے۔ ان کی تمام پیشین گوئیاں اور یقین دہانیاں قطعی غلط ثابت ہو چکی تھیں۔ ان کے لئے یہ دعویٰ کرنا بھی ممکن نہ تھا کہ انہیں بھارتی حملے کی کوئی پیشگی اطلاع موصول نہیں ہوئی تھی۔

۳/ ستمبر کی شام کو بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری نے آل انڈیا ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے اپنے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ ملک کو درپیش "اس سنگین گھڑی میں اپنا فرض ادا کریں" اور انہیں آنے والے کٹھن وقت سے ہوشیار کیا تھا۔ "جب انہیں فضائی حملوں کے نتیجے میں نقصان بھی ہو سکتا تھا۔" شاستری کی یہ تقریر سننے کے بعد یہ شبہ باقی نہیں رہنا چاہئے تھا کہ بھارت نے پاکستانی علاقوں پر حملے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ البتہ پاکستانی جی ایچ کیو اور وزارت خارجہ کا معاملہ دوسرا تھا جہاں خوش گمانیوں کا راج تھا اور جہاں غالباً کسی نے شاستری کی تقریر کو سننے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کی تھی۔

نئی دہلی میں پاکستانی ہائی کمشنر میاں ارشد حسین نے دہلی میں ترکی سفارت خانے سے درخواست کی کہ وہ ان کا ایک خفیہ پیغام کراچی پہنچادے' ترکی سفارت خانہ نے وہ پیغام کراچی میں متعین اپنے سفیر کے ذریعے سیکرٹری وزارت خارجہ عزیز احمد کو پہنچادیا۔

ایوب خان کو لاہور کی طرف بھارتی پیش قدمی کی اطلاع ڈیوٹی پر مامور فضائیہ کے ایک افسر نے صبح ۴ بجے جگا کر دی۔ ایوب خان نے موسیٰ خان کو ٹیلی فون کیا۔ ان تک بھی یہ خبر پہنچ چکی تھی مگر وہ اس کی تصدیق کا انتظار کر رہے تھے۔

حقیقت ایوب خان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے کابینہ کا اجلاس بلا کر اپنے رفقاء سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بھارتی حملے کا پوری قوت سے مقابلہ کیا جائے گا۔ انہوں نے بغیر کسی تاخیر کے عوام کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا۔ بھٹو اور آغا شاہی نے جو اس وقت وزارت خارجہ میں ایڈیشنل سیکرٹری تھے۔ ایوب خان کی تقریر کا مسودہ تیار کیا جو انہیں پسند نہ آیا۔ ایوب خان نے سیکرٹری اطلاعات کو جو ان کے تقریر نویس بن چکے تھے' نئی تقریر لکھنے کی ہدایت کی۔ اس مرحلے پر ایوب خان کو یہ خیال آیا کہ انہیں اردو میں بھی تقریر کرنی چاہئے۔ انہوں نے ۱۲ بجے دوپہر انگریزی میں اور پھر سہ پہر ۳ بجے اردو میں بھی تقریر کی۔ ایوب خان کے پرجوش خطاب نے سننے والوں کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ ایوب خان کی تقریر سے پوری قوم میں جذبے کی لہر دوڑ گئی اور وہ ایک سیسہ پلائی دیوار کی طرح متحد ہو گئی۔ اب پاکستان کو اپنے دشمن بھارت کا سامنا تھا۔ تمام اختلافات ختم ہو گئے' تمام جھگڑے فراموش کر دیئے گئے۔ ایوب خان جنہیں ڈکٹیٹر کے نام سے پکارا جاتا تھا قوم کے ہیرو بن چکے تھے۔ ایسا ہیرو جس نے بھارتی چیلنج کو پوری جراءت سے قبول کیا تھا اور اب وہ امتحان کی اس گھڑی میں عوام کی قیادت کے لئے سرکھت تھا۔ حکومت نے فیصلہ کیا کہ اخبارات پر کسی قسم کی پابندی نہ لگائی جائے۔ ریڈیو پر نشر ہونے والی تقریروں کی پڑتال کی قدیم رسم بھی ختم کر دی گئی۔ مختلف حکومتوں کی جاری کی ہوئی وہ تمام ہدایات جن کے ذریعے بعض سیاسی لوگوں' شاعروں اور ادیبوں کو سرکاری ذرائع ابلاغ کے لئے بلیک لسٹ کیا گیا تھا' واپس لے لی گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اطلاعات کا سرکاری نظام قوم کی آواز بن گیا۔ عوام اپنے ریڈیو اور ٹیلی ویژن سیٹوں سے جڑے بیٹھے تھے جو انہیں پرجوش قومی نغموں اور نظموں سے گرما رہے تھے۔ تخلیقی قوت کے اس اچانک اظہار نے اپنے سحر سے عوام کو مبہوت کر دیا۔

۷/ ستمبر کو خبر آئی کہ جنرل حمید کی ۱۱ ڈویژن نے کھیم کرن محاذ پر روہی نالے کو پار کر کے دشمن کے علاقے میں پوزیشن قائم کر لی ہے۔ اب جوابی حملے کے لئے تیار کئے گئے فوجی پلان "میلڈ فسٹ" (MAILED FIRST) کے لئے سٹیج تیار ہو چکی تھی۔ اس پلان کا مقصد امرتسر پر قبضہ کرنا تھا۔ ایوان

صدر میں جہاں کابینہ اور اس کی سب کمیٹیوں کے اجلاس مسلسل جاری رہتے جذبات کا عجیب عالم تھا۔ جنرل موسیٰ اور ائیرمارشل نور خان وقفے وقفے سے کمرے میں داخل ہوتے اور ایوب خان سے کچھ گفتگو کرتے۔

جنگ کے آغاز کے ایک روز بعد ایوب خان نے سیاسی رہنماؤں کو مشورے کے لئے بلانے کا فیصلہ کیا۔ بدقسمتی سے ڈھاکہ سے فضائی رابطہ کٹ چکا تھا' اس لئے بنگال سے کوئی بھی سیاستدان راولپنڈی نہ پہنچ سکا۔ چودھری محمد علی' مولانا ابوالاعلیٰ مودودی' سردار شوکت حیات' چودھری غلام عباس اور خواجہ صفدر' ایوب خان کی دعوت پر ان سے ملنے کے لئے آئے۔ جب ایوب خان ملاقات کے کمرے کی طرف جا رہے تھے تو انہوں نے سیکرٹری اطلاعات سے کہا "آپ نے میرے تمام دشمنوں کو اکٹھا کر لیا ہے"۔ ایوب خان جب کمرے میں پہنچے تو وہاں دشمنوں کی بجائے پرجوش دوستوں نے ان کا استقبال کیا۔ وہ سب کے سب انہیں اپنی مکمل حمایت کا یقین دلا رہے تھے۔ غلام عباس نے تقریر کرتے ہوئے کہا "کشمیر کے لئے ایوب خان نے جو کچھ کیا ہے پاکستان میں کسی اور کے بس کی بات نہ تھی"۔

۸/ ستمبر کو سرحد کے پار بھارت کے اہم گاؤں کھیم کرن پر پاکستانی فوج نے قبضہ کر لیا اور دفتر خارجہ ایک بار پھر جوش میں آ گیا۔ عزیز احمد چاہتے تھے کہ امرتسر پر فضائیہ کے ذریعے لاکھوں کی تعداد میں اس مضمون کے پمفلٹ گرائے جائیں کہ پاکستان کا مقصد سکھوں کو ہندوؤں کی بالادستی سے نجات دلانا ہے۔ بھٹو کشمیر کے علاقوں' سرحد اور پنجاب میں برادریوں کا سروے کرانا چاہتے تھے۔ بھٹو نے کہا کہ جموں اور کشمیر میں ریفرنڈم کے بعد مختلف اضلاع کی سرحدیں نئے سرے سے تشکیل دینا پڑیں گی۔

۹/ ستمبر کا سارا دن جوابی حملے کے بارے میں کسی خبر کے بغیر گزر گیا۔ بھارتیوں نے کھیم کرن کے محاذ پر خاصی زور آزمائی کی مگر ان کے حملوں کو ناکام بنا دیا گیا۔ جی ایچ کیو نے لاہور کی سرحد پر اپنے جوانوں کی مدد کے لئے قبائلیوں کو لاہور کی سرحد پر بلایا تھا۔ ان قبائلیوں نے محاذ کے راستے میں آنے والی ہر دکان لوٹ لی مگر انتظامیہ نے ان واقعات کو میدان کار زار کی طرف جانے والے قبائلیوں کے اظہار مسرت کا روایتی انداز قرار دیا۔ جنرل حمید کے لئے یہ قبائلی درد سر بن گئے کیونکہ پنجاب کے بارڈر کے ساتھ کوئی پہاڑی علاقہ نہ تھا جہاں چٹانوں کی آڑ لے کر وہ اپنے روایتی جوش و خروش کا مظاہرہ کر سکتے۔ انہوں نے میدانی علاقوں میں جہاں ان کے اور دشمن کے بمبار طیاروں کے درمیان گرد کی چادر کے سوا کوئی رکاوٹ نہ تھی' مورچوں سے باہر نکلنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ جنرل حمید کو زبردستی انہیں ان کی قبائلی پناہ گاہوں میں واپس بھیجنا پڑا۔

اقوام متحدہ نے ۴ اور ۶ ستمبر کو قراردادیں منظور کیں جن میں دونوں ملکوں سے نابندی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ سیکرٹری جنرل اوتھانٹ پاکستان آئے اور انہوں نے ایوب خان سے ملاقات کی۔ سعودی عرب کے شاہ فیصل نے پاکستان کو مالی امداد کی پیشکش کی۔ انڈونیشیا سے کچھ جدید جنگی طیارے ملنے کا امکان بھی تھا مگر ایوب خان کو خوف تھا کہ انہیں روس نہ روک دے۔ فرانس نے ۱۳ طیاروں کا وعدہ کیا جن میں ۱۰ فوری طور فراہم کئے جانے تھے۔ پاکستان اور ترکی کے درمیان دو طرفہ معاہدہ کی موجودگی کے باوجود ترکی سے اسلحے کی فراہمی کا معاملہ مشکوک تھا۔ ایوب خان نے ۹/ ستمبر کو کابینہ کو بتایا کہ پاکستان کی طرف سے پیش قدمی کی کسی بھی کوشش کو بھارت کی شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

پاکستان میں امریکی سفیر نے ۹/ ستمبر کو بھٹو سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی۔ یہ ایک ناخوشگوار ملاقات تھی۔ امریکی سفیر نے بھٹو کو بتایا کہ کانگریس نے پاکستان اور بھارت دونوں کی فوجی امداد بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے لیکن اسے تادیبی کارروائی نہ سمجھا جائے۔ اس فیصلے کا مقصد مسئلے کے پرامن حل کے لئے یو این سیکرٹری جنرل کی مدد کرنا ہے۔ بھٹو کی برانگیختی فطری بات تھی۔ امریکہ کا پرانا دوست اور اتحادی پاکستان اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا اور وہ اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے پر تلا بیٹھا تھا۔ بھٹو نے امریکی سفیر کو خبردار کیا کہ امریکہ کا یہ فیصلہ پاکستان اور امریکہ کے تعلقات کے لئے نقصان دہ ہو گا۔ جب بھٹو نے کہا کہ پاکستان کے شہروں پر بم گرائے جا رہے ہیں تو امریکی سفیر نے سوال کیا کہ آپ کو جنگ بندی لائن کے پار مسلح لوگ بھیجنے سے پہلے اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔ بھٹو نے ایسے کسی آپریشن میں پاکستان کے ملوث ہونے کے بارے میں سرے سے انکار کر دیا۔ تاہم انہوں نے تسلیم کیا کہ مجاہدین کو پاکستان کی حمایت حاصل ہے۔ بھٹو نے کہا کہ "جارحیت کا ارتکاب بھارت کی طرف سے ہوا ہے اور ہم اپنی بقا اور وقار کی جنگ لڑ رہے ہیں۔"

امور خارجہ' دفاع' خزانہ اور اطلاعات کے محکموں کے سیکرٹریوں نے صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے ۱۰ ستمبر کو فوجی حکام کے ساتھ ملاقات کی۔ اس اجلاس میں ہونے والا ایک فیصلہ یہ بھی تھا کہ "دفتر خارجہ اور وزارت اطلاعات بھارت کے ساتھ موجودہ جنگ میں پاکستان کے سیاسی مقاصد کے مسئلے کا جائزہ لیں گے اور اس موضوع پر ایک پیپر تیار کریں گے۔

اجلاس میں روز بروز کم ہوتے پٹرولیم اور دیگر ضروری اشیاء کے ذخائر کی صورتحال پر بھی گہری تشویش کا اظہار کیا گیا۔ پیرس میں پاکستان کے سفیر کو پیغام بھیجا گیا کہ وہ فرانسیسی لڑاکا طیاروں کی جلد خریداری کا بندوبست کریں۔ اسی طرح انقرہ میں پاکستانی سفیر کو ترکی سے جنگی طیاروں کے اضافی پرزوں کے جلد حصول کی ہدایت کی گئی۔ دریں اثنا ائیرمارشل اصغر خان جنگی طیاروں' اسلحے اور گولے بارود کے حصول کے لئے چین' انڈونیشیا' ترکی اور ایران کے دورے پر روانہ ہو چکے تھے۔ ایوب خان کو اس دورے کی تجویز خود اصغر خان کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔ سیکرٹری دفاع کو اس سوال کا جائزہ لینے کا کام سونپا گیا کہ "بھارت کے ساتھ پاکستان کا موجودہ تصادم کتنے دن چل سکتا ہے اور پاکستان کی دفاعی ضروریات کیسے پوری کی جا سکتی ہیں۔" کسی نے یہ واضح کرنے کی زحمت نہ کی کہ ان سنگین مسائل پر پہلے توجہ کیوں نہ دی گئی تھی۔

ایوب خان نے ۱۰/ ستمبر کو اوتھانٹ کے ساتھ ایک اور ملاقات کی۔ انہوں نے ایک بار پھر سیکرٹری جنرل کو سمجھانے کی کوشش کی کہ محض جنگ بندی کرانے کا کوئی ایسا فیصلہ جس میں اقوام متحدہ کی قرار دادوں کے مطابق مسئلہ کشمیر کے حل کا عملی منصوبہ موجود نہ ہو' ایک بے کار کوشش ہو گی۔ کشمیر کے لوگ گزشتہ ۱۸ برس سے آلام و مصائب کا شکار ہیں اور بھارت طاقت کے ذریعے ان پر تسلط قائم رکھنا چاہتا ہے۔ کشمیر میں جنگ بندی لائن کے دونوں طرف مسلمان بستے ہیں اور جب مقبوضہ کشمیر کے مسلمان اپنی مدافعت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تو پاکستان نے بھی انہیں اخلاقی مدد فراہم کی۔ ایوب خان نے اعتراف کیا کہ "ہم نے بھی ہتھیار دیئے ہیں' مگر یہ ایک فطری اور انسانی تقاضا تھا کیونکہ جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لئے عوام کے پاس اپنے دفاع کے کچھ وسائل تو ہونے چاہئیں۔" انہوں نے کہا کہ بھارت پاکستان کے خلاف جارحیت پر تلا بیٹھا ہے اور اس نے مغربی پاکستان پر یلغار کرنے کے لئے بین الاقوامی سرحدوں پر فوجیں اکٹھی کر لی ہیں۔

۱۱/ ستمبر پاکستان کے لئے فیصلے کا دن ثابت ہوا۔ صبح ۹ بجے ایوب خان نے قائداعظمؒ کے یوم وفات کے سلسلہ میں ریڈیو کے لئے اپنا پیغام ریکارڈ کرایا۔ ریکارڈنگ کے بعد وہ سیکرٹری اطلاعات کو کمرے میں لے گئے۔ ابھی وہ کھیم کرن آپریشن کی تفصیلات بیان کر رہے تھے کہ ان کے ملٹری سیکرٹری جنرل رفیع شدید غصے کے عالم میں کمرے میں داخل ہوئے اور انہوں نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا کہ بھارت نے مادھوپور نہر کا پشتہ توڑ دیا ہے۔ ایوب خان سب کچھ بھول گئے۔ وہ فوری طور پر جاننا چاہتے تھے کہ علاقے کو زیر آب آنے میں کتنا وقت لگے گا۔ جی ایچ کیو کو اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا۔ سیکرٹری اطلاعات نے غلام اسحاق خان کو فون کیا جو اس وقت مغربی پاکستان میں واپڈا کے چیئرمین تھے۔ انہوں نے محکمہ آبپاشی کے پرانے ریکارڈ کی مدد سے اندازہ لگایا کہ علاقے کو زیر آب آنے میں آٹھ گھنٹے لگیں گے۔ ایوب خان کو یہ جان کر بہت مایوسی ہوئی کہ آپریشن کے کمانڈر جنرل ناصر نے پرانے نقشوں پر انحصار کیا تھا اور ہمارے ٹینک بڑی تعداد میں دلدل میں پھنس کر ناکارہ ہو چکے تھے۔ بھارت نے دعویٰ کیا کہ کھیم کرن کو پاکستانی ٹینکوں کا قبرستان بنا دیا گیا ہے۔ کھیم کرن کی طرف سے جوابی حملے کا منصوبہ ۱۱ ستمبر کو ٹھپ ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی پاکستان کی تمام تر جنگی حکمت عملی خاک میں مل گئی۔ عملی طور پر پاکستان کی طرف سے جنگ ختم ہو چکی تھی۔

فوج اور فضائیہ پرزوں، ہتھیاروں اور پٹرولیم کی شدید کمی کا شکوہ کر رہے تھے اور پاکستان دوست ممالک سے ان کے حصول کے لئے سرتوڑ کوششوں میں مصروف تھا۔ ۱۱ ستمبر کو عزیز احمد نے ایوب خان کو بتایا کہ ایران اور ترکی دونوں نے پاکستان کو ٹینک شکن اسلحہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ ایوب خان یہ خبر سن کر بہت پریشان ہوئے۔ انہوں نے وزارت دفاع کے سیکرٹری نذیر احمد کو مخاطب کرتے ہوئے کہ "نذیر احمد تم اس کے ذمہ دار ہو۔" سیالکوٹ کے محاذ پر ٹینکوں کے رن پڑ رہے تھے اور پاک فوج کو ٹینک شکن گولوں کی سخت ضرورت تھی۔ ایوب خان یہ جان کر ششدر رہ گئے کہ فوجی حکام غلط قسم کا گولہ بارود درآمد کرتے رہے تھے اور انہوں نے ٹینک شکن گولوں کی بجائے دھماکہ آور گولوں کو منگوایا تھا جن کا بھارتی ٹینکوں پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

۱۳/ ستمبر کو کیبنٹ کے اجلاس کو تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے ایوب خان نے کہا کہ دشمن سیالکوٹ کی سرحد عبور کرنے کے لئے اپنی قوت میں اضافہ کر رہا ہے مگر پاکستانی فضائیہ کو حالات پر مکمل کنٹرول حاصل ہے۔ انہوں نے شکایت کی کہ بین الاقوامی سطح پر بھارت پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا جا رہا۔

اس روز شام کو ایوب خان گھر کے لان میں ایک کتاب لئے بید کے صوفے پر بیٹھے تھے۔ سیکرٹری اطلاعات سے جو اب ان کے "غم گسار" بن چکے تھے، ایوب خان نے کہا کہ "میں ان دنوں جنگی حکمت عملی کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک غلطی پورے آپریشن کی تباہی کے لئے کافی ہوتی ہے"۔ اس کے بعد انہوں نے پوچھا "کیا پاکستان کے عوام اس دلیل کو قبول کر لیں گے کہ ملک کو بچانے کے لئے اب جنگ بندی کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا"۔

سیکرٹری اطلاعات نے کہا کہ "جناب صدر آپ کے پاس ایک ہی کارڈ باقی رہ گیا ہے اور وہ چین سے مدد حاصل کرنا ہے۔" ایوب خان یہ سن کر کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے کتاب کو میز پر رکھتے ہوئے کہا کہ "پھر ہمیں یہ کارڈ استعمال کرنا چاہئے۔" انہوں نے ٹیلی فون اٹھایا اور جنرل رفیع کو ہدایت کی کہ تمام وزیروں کو کابینہ کے ہنگامی اجلاس کے لئے طلب کریں۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر تمام وزیر کیبنٹ روم میں جمع ہو گئے۔ ایوب خان نہایت پراعتماد انداز میں کمرے میں داخل ہوئے اور انہوں نے کابینہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اگر پاکستان نے باوقار شرائط کے بغیر جنگ بندی قبول کر لی تو عوام اسے ہتھیار ڈالنے کے برابر سمجھیں گے۔ انہوں نے کہا "ہمارا بہترین کارڈ چین کا کارڈ ہے۔ اب ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کس مرحلہ پر چینی کارڈ استعمال کرنا چاہئے۔ چینیوں کے ساتھ ہمارا معاملہ کسی چالبازی اور ہیرا پھیری سے پاک ہونا چاہئے۔ ہمارا مقصد انہیں استعمال کرنا نہیں، اگر ان کا اعتماد مجروح ہو گیا تو اگلی دفعہ وہ کہیں گے کہ ہمیں بھی فریب کاری آتی ہے۔" ایوب خان کا خیال تھا کہ وقت آگیا ہے کہ ہم سلامتی کونسل کو بتا دیں کہ پاکستان کوئی ایسی تجویز قبول نہیں کرے گا جس میں کشمیر کے تنازعے کو حل کرنے کی کوئی خود کار تجویز شامل نہ ہو۔ ایوب خان کے اندازے کے مطابق پاکستان اور بھارت دونوں کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس کے بعد مختلف مقامات پر چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کے سوا اب کوئی بڑا حملہ نہیں ہوگا۔ بھٹو نے کہا کہ "سب سے زیادہ اہمیت چین کے موقف کی ہے۔ مشرقی پاکستان چین کی وجہ سے جنگ سے محفوظ رہا ہے۔ پاکستان کی شکست چین کے مفاد میں نہیں۔ چین کشمیر اور پاکستان کا الحاق دیکھنا چاہتا ہے۔ ہندوستان کے عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ چینی مداخلت ہے۔ امریکہ چینیوں کو مشتعل کرنے والی کوئی حرکت نہیں کر رہا اور یہی وجہ ہے کہ وہ جنگ بندی کا خواہاں ہے"۔ ایوب خان نے جنرل موسیٰ سے کہا کہ "جنگ بندی پر رضامند ہونے سے پہلے ہمیں چاہئے کہ ہم بھارتی علاقوں کے اندر ہوں اور بھارت ہمارے علاقوں سے باہر۔" انہوں نے کہ وہ چوکیاں جو بھارت کی پیش قدمی کے بعد قائم کی گئی ہیں بہرصورت فتح ہونی چاہئیں اور جموں و کشمیر میں استصواب رائے کے انعقاد سے پہلے فوجوں کی اگلے علاقوں سے واپسی کا کوئی معاہدہ نہ کیا جائے۔ اس کے بعد ایوب خان نے خاصے سرسری انداز میں کہا کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم اقوام متحدہ سے علیحدہ ہو جائیں، سلامتی کونسل تو بڑی طاقتوں کا محکوم ادارہ بن چکی ہے۔ انہوں نے فیصلہ دیا کہ "جنگ جاری رہنی چاہئے، یہ چار چھ ہفتوں تک چلے یا تین ماہ تک ہمیں اقوام متحدہ پر پورا دباؤ ڈالنا چاہئے۔ سفارتی سطح پر ہماری پوزیشن کمزور نہیں ہے۔"

اس تمام عرصے کے دوران چینی حکومت پاکستان کی مکمل حمایت کرتی رہی تھی۔ چینی وزیر خارجہ مارشل چن ژی نے ۴ ستمبر کو کراچی میں بھٹو سے ملاقات کی جس میں انہوں نے کہا کہ "کشمیر میں بھارت کی مسلح اشتعال انگیزی کو روکنے کے لئے چین پاکستان کے ہر منصفانہ اقدام کی حمایت کرتا رہے گا۔" ۷ ستمبر کو چین نے بھارت کی "مجرمانہ جارحیت" کی مذمت کرتے ہوئے اسے بھارتی حکمرانوں کی شاونیت اور توسیع پسندی کا ایک مظہر قرار دیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ "بھارت سمجھتا ہے کہ چونکہ اسے امریکی استعمار پسندوں اور جدید موقع پرستوں کی پشت پناہی حاصل ہے، لہٰذا وہ اپنے ہمسایوں سے بدسلوکی کرنے، رائے عامہ کو جھٹلانے اور ہر طرح کی من مانی کرنے میں آزاد ہے۔"

بھارت نے چین کے الزامات مسترد کر دیئے اور چین کی شکایات کا جائزہ لینے کے لئے سکم (Sikkam) کی سرحد پر غیر جانبدارانہ "مشاہد" بھیجنے کی تجویز پیش کی۔ ۱۲ ستمبر کو چین نے بھارت کی تجویز کو "مکارانہ" قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا اور کہا کہ اگر بھارت نے سرحد کے ساتھ چینی علاقے میں اپنی تمام فوجی تنصیبات کو تین دن کے اندر اندر نہ ہٹایا، چینی علاقے میں اپنی مداخلت کی کارروائیاں بند نہ کیں، چین کے

اغوا شدہ سپاہی اور جانور واپس نہ کیے تو اسے "تمام نتائج کی ساری ذمہ داری برداشت کرنا پڑے گی۔"

چینی الٹی میٹم میں کشمیر میں "عدم مداخلت" کی پالیسی کا اعادہ کرتے ہوئے کہا گیا تھا "عدم مداخلت" کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ چین کشمیریوں کو ان کے حق خودارادیت سے محروم رکھنے کی توثیق کرتا ہے یا وہ پاکستان کے خلاف بھارتی جارحیت کو حق بجانب سمجھتا ہے۔ بھارت کو صورتحال کی سنگینی کا مکمل طور پر اندازہ ہو چکا تھا' چنانچہ اس نے سوویت یونین' امریکہ اور برطانیہ سے رابطہ کیا کہ وہ چین کی جانب سے بھارت پر کسی ممکنہ حملے کے خلاف چین کو متنبہ کرنے کے لئے مشترکہ وارننگ جاری کریں۔ ماسکو میں کوسیجن (Kosygin) نے بھارتی سفیر بی کے نہرو سے وعدہ کیا کہ سوویت یونین بھارت کو اسلحے کی باقاعدہ سپلائی جاری رکھے گا۔ واشنگٹن میں ڈین رسک (Dean Rusk) نے بی کے نہرو کو یقین دلایا کہ اگر چین نے بھارت پر حملہ کیا تو امریکہ بھارت کو فوجی امداد فراہم کرنے کے باہمی فوجی معاہدے پر پوری طرح عمل کرے گا۔ برطانیہ نے بھی بھارتی تشویش پر مثبت ردعمل کا اظہار کیا اور برطانوی وزیراعظم ہیرلڈ ولسن (Harold Wilson) نے ایک بیان میں کہا کہ "اگر چین نے بھارت پر حملہ کیا تو برطانیہ اور امریکہ اس کی مدد کرنے پر رضامند ہوں گے۔" بھارت اپنی تمام کوششوں کے باوجود تینوں بڑی طاقتوں سے مشترکہ اعلامیہ جاری کروانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ایوب خان اور دفتر خارجہ دونوں بھارت اور امریکہ کے درمیان ۱۹۶۲ء میں طے پانے والے معاہدے کی تفصیلات سے بے خبر تھے جن کے مطابق بھارت پر چینی حملے کی صورت میں امریکہ بھارت کو فوجی امداد بہم پہنچانے کا پابند تھا۔

جنگ کے دوران ۳۰۰ کے قریب غیر ملکی اخباری نمائندے پاکستان میں آ گئے تھے۔ ایوب خان نے ۱۵ ستمبر کو پریس کانفرنس سے خطاب کرنے کا فیصلہ کیا۔ سیکرٹری اطلاعات نے متوقع سوالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایوب خان کے لئے پریس کانفرنس کا مسودہ تیار کیا۔ اس مسودے میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا تھا کہ پاکستان اس وقت تک جنگ بندی قبول نہیں کرے گا جب تک جنگ بندی کے فیصلے میں کشمیر کے مسئلے کے خود کار حل کی ضمانت درج نہیں کی جاتی اور پاکستان جنگ کے منطقی انجام تک بھارت سے لڑنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ طے یہ ہوا تھا کہ ایوب خان پریس کانفرنس میں فیلڈ مارشل کی یونیفارم پہن کر آئیں گے' مگر جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے ایک سلیٹی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ ان کا چہرہ زرد تھا اور وہ افسردہ خاطر دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے اس مسودے کو جسے وہ ایک گھنٹہ قبل منظور کر چکے تھے' نظر انداز کرتے ہوئے پریس کانفرنس کے آغاز میں ہی صدر جانسن سے خطے میں امن قائم کرنے کی اپیل کی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پریس کانفرنس سے تھوڑی دیر پہلے انہوں نے فوج اور فضائیہ کے سربراہوں سے ملاقات کی تھی جس کے دوران سیکرٹری دفاع نے فوجی ذخائر اور سپلائی کی صورتحال کے بارے میں رپورٹ پیش کی تھی اور ان دونوں سربراہوں نے ایوب خان کو امریکہ سے فوری مدد کی اپیل کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ پریس کانفرنس میں موجود غیر ملکی نمائندے پاکستان کے مؤقف میں اس ڈرامائی تبدیلی پر حیران رہ گئے۔

پریس کانفرنس میں موجود ذوالفقار علی بھٹو کے لئے ایوب خان کی صدر جانسن سے اپیل صدمے اور حیرانی کا باعث تھی۔ انہوں نے غیر ملکی اخباری نمائندوں کی خبروں کی بیرون ملک ترسیل رکوا دی۔ یہ نمائندے سیدھے سیکرٹری اطلاعات کے پاس پہنچے۔ سیکرٹری اطلاعات نے ایوب خان کو اس معاملے میں آگاہ کیا جنہوں نے اس مسئلے پر بات کرنے کے لئے بھٹو کو طلب کیا۔ بھٹو کا اصرار تھا کہ اگر خبروں کی ترسیل کی اجازت دے دی گئی تو اس کا پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ سیکرٹری اطلاعات نے اپنا موقف پیش کرتے ہوئے کہا کہ صدر نے پریس کانفرنس میں جو کچھ کہا ہے اس کی خبر دنیا بھر کو ہو چکی ہے۔ غیر ملکی نمائندوں کی خبریں روکنے سے اپنے عوام کو بیوقوف بنانے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ایوب خان کی سمجھ میں یہ دلیل آ گئی اور انہوں نے خبروں کی بغیر سنسر (Censor) کے بیرون ملک ترسیل کی اجازت دے دی۔ ایوب خان کی جانسن سے اپیل ان کے ساتھیوں کے لئے نہایت حیرت کا باعث تھی۔ انہوں نے کبھی کوئی ایسا عندیہ نہیں دیا تھا کہ وہ اس طرح کی سلسلہ جنبانی کرنے والے ہیں۔ جانسن سے ذاتی اپیل کرنے کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے چین کا کارڈ واپس رکھ دیا تھا۔ ظاہر تھا کہ ایوب خان اس خیال سے کہ کہیں جنگ غیر ضروری شدت اختیار کر جائے اسے طول نہیں دینا چاہتے تھے۔ ایوب خان کی پریس کانفرنس کے فوراً بعد بھارتی وزیر خارجہ نے یہ بیان دیا کہ پاکستان کشمیر کا خیال دل سے نکال دے اور وزیراعظم شاستری نے اعلان کیا "صدر ایوب کے بیان کے باوجود بھارت کی جنگی کارروائیاں پورے زور و شور سے جاری رہیں گی۔"

جنگ کے محاذ پر صورت حال پاکستان کے حق میں نہیں جا رہی تھی۔ بھٹو اپنا موقف بدل چکے تھے اور اب انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ سفارت کی طاقت فوجی طاقت کا بدل نہیں ہو سکتی۔ اعلیٰ سطحی اجلاس میں بھٹو اور عزیز احمد پر اب شدید تنقید ہونے لگی تھی۔ ان سے پوچھا جاتا کہ وہ کیوں اس بات پر اصرار کرتے رہے کہ بھارت کسی حال میں بھی بین الاقوامی سرحد عبور نہیں کرے گا' اس سوال کا جواب وہ یہ دیتے کہ دفتر خارجہ نے بھارتی عزائم کے بارے میں کوئی یقین دہانی نہیں کرائی تھی' اپنا اندازہ پیش کیا تھا۔

جنگ بندی کی قرارداد ۱۸/ ستمبر کو رات ۱۰ بجے موصول ہوئی۔ آغا شاہی اس وقت نیویارک میں تھے۔ انہیں ہدایت کی گئی تھی کہ وہ مجوزہ قرارداد میں سلامتی کونسل کی گزشتہ قراردادوں کا حوالہ شامل کرانے کی کوشش کریں اور قرارداد میں کوئی ایسی شق شامل نہ ہو جس میں کشمیر سے فوجوں کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا ہو۔ بھارتیوں کی خواہش تھی کہ یہ قرارداد ایک سیدھی سادھی جنگ بندی کی قرارداد ہونی چاہئے اور اس میں سلامتی کونسل کی کسی پرانی قرارداد یا کشمیر کے مسئلے کا کوئی حوالہ نہ دیا جائے۔ یہ قرارداد ہالینڈ کی طرف سے پیش کی گئی جس کے نمائندے نے کہا سلامتی کونسل کوئی عدالت نہیں ہے اور نہ اسے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ بھارت اور پاکستان میں سے جارحیت کا مرتکب کون ہوا ہے؟ ایوب خان نے فیصلہ کیا کہ کم از کم ریکارڈ کی خاطر اس قرارداد کی مخالفت کی جائے۔ فرانس کے وزیر خارجہ بھٹو کو یقین دہانی کرا چکے تھے کہ ان کا ملک پاکستان کے خلاف تجارتی پابندیاں عائد کرنے کی تجویز کی حمایت نہیں کرے گا۔ اتوار ۱۹/ ستمبر کو برطانوی ہائی کمشنر مارس جیمز (Morrice James) نے ایوب خان کو ہیرلڈ ولسن کا ایک خط پیش کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ پاکستان کے مقابلے میں بھارتی افواج کی تعداد بالآخر نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے۔ ولسن (Wilson) نے اپنے خط میں یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ چینی پاکستان کی خاطر کوئی خطرہ کیوں مول لیں گے۔ جب برطانوی ہائی کمشنر نے مذکورہ خط عزیز احمد کے حوالے کیا تو انہوں نے کہا "اگر آپ یہ قرارداد ہم پر مسلط کریں گے تو یہ آپ کی طرف سے عالمی جنگ کا آغاز ہو گا"۔

اس مرحلے پر ایوب خان نے فیصلہ کیا کہ انہیں

اس ساری صورتحال پر چو این لائی (Chou En Lai) سے براہ راست بات کرنی چاہئے۔ وہ اس مقصد کے لئے ۱۹ اور ۲۰ ستمبر کی درمیان شب پشاور سے طیارے کے ذریعے بیجنگ پہنچے اور اگلی شب واپس آ گئے۔ ایوب خان کے اس دورے کو مکمل طور پر خفیہ رکھا گیا اور پاکستان میں بہت کم لوگوں کو اس کا علم تھا۔ ایوان صدر میں روز مرہ کے معمول کو سختی سے برقرار رکھا گیا۔ ایوب خان کے لئے صبح کی چائے لے جانے والا اسی طرح برتن سجا کر ان کے کمرے تک لے گیا اور خالی ٹرے واپس لایا۔ ایوان صدر کے سیکورٹی گارڈوں کو بھی یہ شائبہ نہ ہوا کہ ایوب خان اندر موجود نہیں ہیں۔ بھٹو اس دورے میں ایوب خان کے ہمراہ تھے۔ چو این لائی نے کہا کہ عددی قوت کی برتری عوام کے عزم کو مسخر نہیں کر سکتی۔ ایوب خان نے واضح کیا کہ پنجاب کا میدانی علاقہ دشمن کی بڑھتی ہوئی فوجوں کے خلاف گوریلا کارروائیوں کے لئے مناسب نہیں ہے۔ اس مرحلہ پر مارشل چن ژی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "ہر چھوٹی بڑی نہر اور ٹیلے کو مورچے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے"۔ چو این لائی نے کہا "آپ یہ مت بھولیں کہ ہم اس تمام عرصے میں بھارت پر اپنا دباؤ قائم رکھیں گے"۔

ایوب خان نے چو این لائی کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ پاکستان چین کا دوست ہے اور وہ نہرو کی طرح اپنی بات سے پھرنے والے نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کے یہ جذبات چیئرمین ماؤ کو پہنچا دیئے جائیں۔ بات چیت کے اختتام تک یہ واضح ہو چکا تھا کہ اگر پاکستان چین کی مکمل حمایت چاہتا ہے تو اسے ایک طویل جنگ کے لئے تیار ہونا پڑے گا جس میں لاہور اور بعض اور شہر دشمن کے قبضے میں بھی جا سکتے تھے' تاہم جیسا کہ چینی رہنماؤں کا خیال تھا کہ پاکستان کو پہنچنے والا ہر نقصان پاکستان کے عوام کو متحد کرنے کا باعث ہو گا اور بھارتی فوجیں عوامی مزاحمت کے نرغے میں پھنس کر رہ جائیں گی۔ بھٹو اور ایوب دونوں میں سے کوئی بھی اس کام کے لئے تیار نہ تھا۔ دفتر خارجہ کی تمام تر حکمت عملی یہ تھی کہ کسی طرح بھارت کو گھیر کر مذاکرات کی میز پر لے آیا جائے۔ ایوب خان نے جنگ سے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا کہ بھارت چند شدید ضربوں سے زیادہ کا متحمل ہو سکے گا اور بھٹو کے ذہن میں کسی طویل عوامی جنگ کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ سب سے بڑھ کر بری فوج اور پاک فضائیہ جنگ کو مزید طول دینے کے خلاف تھیں۔

جنرل موسیٰ اسلحے اور اضافی پرزوں کی شدید قلت کی بنا پر حوصلہ ہارے ہوئے تھے اور ایئر مارشل نور خان طیاروں کی روز بروز گھٹتی ہوئی تعداد سے دلبرداشتہ تھے۔ ہر حملے کے بعد پاک فضائیہ کے دو ایک طیارے کم ہو جاتے تھے۔

۲۱/ ستمبر کو بھٹو نے جنگ بندی کی تازہ ترین قرارداد کے مسودے پر غور کرنے کے لئے اعلیٰ حکام کا ایک اجلاس طلب کیا۔ اجلاس کے شرکاء نے بھٹو کو پاکستان کو انتہائی ہزیمت آمیز صورت حال کا شکار بنانے کا ذمہ دار قرار دیا اور ان پر بزدلی کے دے ہوئی۔ بھٹو اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکے اور انہوں نے روتے ہوئے کہا "میرا سیاسی کیریئر تباہ ہو چکا ہے' مجھے استعفیٰ دے کر بیرون ملک چلے جانا چاہئے۔" یہ کہہ کر بھٹو کمرے سے نکل گئے۔ اسی شام بھٹو نے ایوب خان سے کہا کہ امریکہ فوری جنگ بندی کا طالب ہے کیونکہ وہ جنگ میں وسعت کی اجازت دینے کے لئے تیار نہیں۔ بھٹو نے مشورہ دیا کہ اس مرحلے پر جنگ بندی کا فیصلہ پاکستان کے لئے خفت کا باعث نہیں ہو گا' اس کے برعکس حکمت عملی کا حربہ سمجھا جائے گا۔ انہوں نے کہا "پاکستان کو اس وقت ایک کڑی آزمائش کا سامنا ہے۔ وہ اپنے پرانے اتحادیوں سے مکمل طور پر کٹ جائے یا ایک غیر یقینی مستقبل کو قبول کر لے۔" سیکرٹری اطلاعات نے قرارداد کو تسلیم کرنے کے خلاف رائے دی جبکہ بھٹو اور عزیز احمد نے اس کے حق میں دلائل دیئے۔

ایوب خان نے ایک بار پھر سیاسی رہنماؤں کو مدعو کیا اور جنگ بندی کی قرارداد کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی۔ ان رہنماؤں نے متفقہ طور پر مذکورہ قرارداد کو مسترد کرنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ اگر غیر مشروط جنگ بندی پر رضامندی کا اظہار کیا گیا تو عوام سمجھیں گے کہ ان سے کھلم کھلا غداری کی گئی ہے۔

سوویت سفیر نے ایوب خان کو سیجن کا ایک پیغام دیا جس میں ایوب خان اور شاستری کی تاشقند میں ملاقات کے لئے روس کی خدمات کی پیشکش کی گئی تھی۔ پیغام میں امید ظاہر کی گئی تھی کہ یہ ملاقات تعمیری نتائج کی حامل ہو گی۔ ایوب خان ایسی کسی بھی ملاقات کی افادیت کے بارے میں پر امید نہیں تھے۔

ایوب خان کو اصل فکر یہ تھی کہ بھارت کہیں لاہور پر قبضہ نہ کر لے۔ انہوں نے مایوسی کے عالم میں بھٹو سے کہا "ہمیں اب اپنے آپ کو اس چنگل سے نکالنا چاہئے۔" بھٹو نے چینی سفیر سے رابطہ قائم کیا۔ چینی سفیر نے بھٹو سے کہا "آپ کو واقعی مشکلات کا سامنا ہے۔ امریکہ بے شک ایک بڑی طاقت ہے' تاہم آپ کو خطرے کا مقابلہ کرنا چاہئے"۔ بھٹو نے اس گفتگو سے ایوب خان کو مطلع کر دیا۔

ایوب خان نے قرارداد کے مسودے پر غور کرنے کے لئے ۲۱/ ستمبر کو اپنے وزیروں کو طلب کیا۔ جب بھٹو قرارداد کا مسودہ پڑھ کر سنا رہے تھے تو ایوب خان نے وزیر صنعت الطاف حسین سے مخاطب ہو کر کہا "اس پر اداریہ مت لکھنا" الطاف حسین "ڈان" کے ایڈیٹر رہ چکے تھے اور وزیر بننے کے باوجود اخبار کے لئے اداریے لکھا کرتے تھے۔

ایئر مارشل نور خان نے مطالبہ کیا کہ جنگ بندی کی قرارداد اور سوویت یونین کی دعوت دونوں فوراً تسلیم کر لی جائیں اور جب الطاف حسین نے کہا کہ چین کے خوف سے امریکی انتظامیہ میں گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوئے ہیں تو نور خان کے چہرے کی رگوں کا تنا بانا الجھ گیا۔ مغربی پاکستان کے گورنر نواب کالا باغ جو ۶/ ستمبر سے منظر سے غائب ہو گئے تھے خاص طور پر اس اجلاس میں مدعو کئے گئے تھے۔ ایوب خان ان پر آڑے وقت میں انحصار کر سکتے تھے۔ حسب توقع نواب کالا باغ نے قرارداد کو فوراً تسلیم کرنے کی بھرپور حمایت کی۔

جنگ بندی کو تسلیم کرنے کے بارے میں ایوب خان کی تقریر کا مسودہ سیکرٹری اطلاعات نے ڈیڈ لائن کے خاتمے سے ایک گھنٹہ قبل تیار کر لیا تھا۔ اس موقع پر اس سے بہتر پیرایہ اظہار کیا ہو سکتا تھا کہ "جنگ بندی" کا مطلب یہ نہیں کہ جنگ ختم ہو چکی ہے۔ "سیز فائر" کا معروف اردو ترجمہ "جنگ بندی" ہے مگر اس سے جنگ کے خاتمے کا تاثر ملتا تھا۔ اس تاثر سے بچنے کے لئے عوام کو یہ باور کرانا تھا کہ پاکستانی فوجی فائر بندی کر دیں گے مگر اپنے مورچوں پر ڈٹے رہیں گے۔ عوام نے ایوب خان کی تقریر سے یہی تاثر لیا کہ پاکستان نے امریکی دباؤ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا ہے اور اگر بھارت نے کشمیر کے مسئلہ پر اپنی ہٹ دھرمی نہ چھوڑی تو جنگ دوبارہ شروع ہو جائے گی۔ اس لفظی شعبدہ بازی کے باوصف ایوب خان کی تقریر عوام کے لئے مایوسی کا پیغام ثابت ہوئی۔ مشرقی پاکستان میں البتہ جنگ کے خاتمے کا خیر مقدم کیا گیا کیونکہ جنگ کے دوران ملک کے اس حصے کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تھا۔OO

سندھیوں اور مہاجروں کے مفادات ایک ہیں

ڈاکو جانور ائیں کو ضمانت پر رہا کرا کر سینکڑوں لوگوں کو قتل کرایا گیا

سندھی قوم پرستوں کو بنگلہ دیش میں محصور مہاجرین کی پاکستان آمد میں رکاوٹ نہیں بننا چاہئے

گیاہ ضعیف

جب برعظیم ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی اور دنیا کے نقشہ پر اس وقت دنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت پاکستان کے نام سے ابھری تو ہندوستان کے اقلیتی صوبوں کے مسلمان خاصی بڑی تعداد میں ہجرت کر کے یہاں آکر آباد ہوئے۔ چونکہ بہار اور بنگال مشرقی پاکستان سے قریب تر تھے لہٰذا یہاں ان صوبوں کے لوگوں نے رخ کیا۔ جبکہ یو پی' سی پی اور دیگر صوبوں کے لوگ مغربی پاکستان میں آکر آباد ہوئے۔ مغربی پاکستان کے صوبہ سندھ کے لیڈر جی۔ ایم۔ سید نے مہاجروں کو اس صوبے میں آباد ہونے کی پیشکش کی تھی مزید برآں' کراچی چونکہ پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے لہٰذا پاکستان کے اس خطے میں ہجرت کر کے آنے والوں کی اکثریت کراچی ہی میں آباد ہو گئی۔ خواہ بنگال ہو یا سندھ دونوں مقامات پر ان مہاجرین کی مقامی آبادی نے بڑی آؤ بھگت کی۔ مہاجرین کی اکثریت چونکہ ہندوستان سے OPT کر کے آئی تھی اور یہ لوگ نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ بھی تھے لہٰذا سول بیورو کریسی میں ان کی تعداد اچھی خاصی تھی بلکہ صحیح معنوں میں چاہے سرکاری ادارے ہوں یا نیم سرکاری ادارے ان کے انتظامات مہاجروں نے سنبھالے۔ لیکن رفتہ رفتہ مقامی آبادی اور مہاجروں کے درمیان خلیج بڑھتی گئی جس میں نفرت اور تعصب کا عنصر غالب آنے لگا اور یہ آتش فشاں مشرقی پاکستان میں ایوب خان کے اقتدار کے زوال سے کچھ قبل یعنی ۱۹۶۸ء میں اور مغربی پاکستان میں پاکستان کے ورلخت ہونے کے فوراً بعد یعنی ۱۹۷۱ء میں لسانی فسادات کی صورت میں پھٹ پڑا۔ پاکستان کی سیاست میں ۱۹۶۸ء تک جو نشیب و فراز آئے اس میں مہاجروں کے کردار کو مشرقی پاکستان میں پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا گیا۔ مہاجرین کی عظیم اکثریت اپنے آپ کو معماران پاکستان میں شمار کرتی تھی اور حکومتی سطح پر بنگالیوں اور بنگالی قیادت کے بارے میں اس قدر منفی پروپیگنڈا کیا گیا جس سے ایک عمومی تاثر یہ ابھرا کہ یہ لوگ پاکستان کے لئے حب الوطنی کا جذبہ نہیں رکھتے بلکہ اس کی بنیادوں پر تیشہ چلانے میں مصروف ہیں۔ یہ بات مہاجر کیسے برداشت کر سکتے تھے لہٰذا فطری طور پر مغربی پاکستان کی قیادت کی جانب ان کا رجحان غالب رہا۔ اور یہی بات ان دونوں طبقوں میں نفرت کی بنیاد بنی۔ ایوب خان جب کبھی مشرقی پاکستان کے دورے پر جاتے تو ڈھاکہ ایرپورٹ پر محمد پور اور میرپور سے مہاجرین جو وہاں بہاری کے نام سے پکارے جاتے تھے کیونکہ ان کی اکثریت صوبہ بہار سے آنے والوں پر مشتمل تھی' ڈھول تاشوں کے ساتھ پہنچ جاتے۔ ۱۹۷۰ء میں عوامی لیگ کی کامیابی کے باوجود اس کو اقتدار منتقل کرنے میں جب لیت و لعل سے کام لیا گیا تو بنگالیوں کو توقع تھی کہ وہ ان کا ساتھ دیں گے۔ لیکن مذکورہ عام انتخابات کے بعد سے آرمی آپریشن کے آغاز تک ان کے رویئے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی' بلکہ اس کے برعکس انہوں نے وہاں انجمن مہاجرین کے نام سے اپنی ایک الگ تنظیم قائم کر لی جو آرمی ایکشن کے دوران پیرا ملٹری فورسز Pakistan Civil Armeo Forces East کو افرادی قوت فراہم کرنے کا ذریعہ بنی۔ اس پر جلتی کا کام جماعت اسلامی کی تنظیموں البدر اور الشمس میں مہاجر نوجوانوں کی شمولیت نے کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں جہاں بنگالی بہتر پوزیشن میں تھے انہوں نے غیر بنگالیوں کا قتل عام کیا۔ پورے نارتھ بنگال کے مہاجرین کا قتل عام ہوا۔ چاٹگام اور کرنافلی میں خاصی بڑی تعداد میں مہاجرین قتل کئے گئے۔ اور سقوط ڈھاکہ کے بعد تو بنگلہ دیش رائفل اور مکتی باہنی کو کھلی چھٹی مل گئی وہ تو اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کی فوج کے ذریعہ ان کا تحفظ کروایا کیونکہ جب تک وہاں ہندوستانی فوج رہی' بنگالیوں کو قتل عام کا موقع نہیں ملا۔ لیکن جیسے ہی یہ فوج وہاں سے رخصت ہوئی' مہاجرین کا قتل عام شروع ہو گیا۔ مہاجرین کے لئے دوہری مصیبت یہ ہوئی کہ Agreement Surrender میں کہا گیا کہ "لسانی اقلیت" کو نہ کہ محصور پاکستانیوں کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ گویا کہ اسی وقت محصور پاکستانیوں کی پاکستانی شہریت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ وہ تو اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کی حکومت ہی کے ذریعہ مہاجرین مشرقی پاکستان کی ایک اچھی خاصی تعداد کو پاکستان پہنچانے کا بندوبست کروایا اور شملہ سمجھوتے کے تحت پاکستان کو انہیں لینے پر مجبور کیا گیا اور وہ بھی اس وقت تک جب تک پاکستان کی فوج کا آخری فوجی پاکستان نہ پہنچ گیا۔ شملہ سمجھوتے کے تحت آج بھی پاکستان منقسم خاندانوں کے افراد کو اور ان افراد کو جو بہت زیادہ مصیبت میں ہیں Distressed Families واپس لینے کا پابند ہے لیکن یہ ایک المیہ ہے کہ پاکستان کی سرزمین کے دروازے اپنے ان محسنوں کے لئے بند کر دیئے گئے ہیں کہ جن کی جدوجہد تحریک پاکستان میں شامل نہ ہوتی تو شاید پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر بھی نہ ہوتا۔ یہ کریڈٹ بھی شاید اسلام کے نام پر بننے والے اس ملک کو حاصل ہے کہ وہ دنیا کا واحد ملک ہے جو اپنے ہی شہریوں کو واپس لینے کے لئے تیار نہیں۔

سقوط ڈھاکہ سے کچھ قبل وہاں حبیب ابراہیم رحمت اللہ مرحوم کی سرکردگی میں ایک تنظیم League Integration کے نام سے بنی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے درمیان حائل خلیج کو پاٹا جائے لیکن یہ کام بہت دیر سے کیا گیا۔ نفرت کی دیواریں اتنی اونچی ہو گئی تھیں کہ ان کو گرانا ممکن نہیں رہا تھا۔ لہٰذا اس تنظیم کو اپنے مقاصد کے حصول میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ماضی کی یہ المناک باتیں اس بیان کو پڑھ کر ذہن میں تازہ ہو گئیں جو جی ایم سید مرحوم کے بڑے صاحبزادے سید امداد محمد شاہ

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

جشن ہمیشہ مردہ قوم منایا کرتی ہے

ہم دولت کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھتے ہیں نہ اس کی امانت تصور کرتے ہیں

حکیم محمد سعید

آج ہم علم' ٹیکنالوجی اور معیشت میں دنیا کی تقریباً تمام قوموں سے پیچھے ہیں

پاکستان میں جشنوں کا بہت زور زورا ہے۔ ہمارا ہر فعل جشن ہے۔ برتھ ڈے کا جشن' شادی کا جشن' حج سے واپسی کا جشن' امتحان میں کامیابی کا جشن' ایوارڈ ملنے کا جشن اور اب نوبت یہ ہے کہ عید میلادالنبی ﷺ بھی جشن ہو کر رہ گئی ہے۔

صاحبان فکر و نظر کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ جشن ہمیشہ مردہ قوم منایا کرتی ہے۔ ایسی مردہ قوم جس کے پاس کوئی اثاثہ علم و حکمت نہ ہو' ایسی مردہ قوم جس نے عیش و عشرت کے عنوان پر اپنی خودی اور آزادی گنوادی ہو اور ایسی قوم جو ظاہر پر خوش ہو جایا کرتی ہو' جشن منانا اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ پاکستان میں ہماری اجتماعی زندگی میں جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں' وہ ان قوموں کی یاد دلاتی ہیں جو تباہ و برباد ہو چکیں اور آج تاریخ کے صفحات میں ان کا نام ایک عاقبت نااندیش قوم کی حیثیت سے آتا ہے۔ جب کسی قوم کے لئے افلاس' غربت اور تباہی مقدر ہو جاتی ہے تو اس میں دولت کے صرف بے جا کی عادت پڑ جاتی ہے اور نمود و نمائش اس کا اجتماعی مزاج بن جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم میں فضول خرچی کی ممانعت کی گئی ہے اور جو لوگ اس گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں' ان کو شیطانوں کا بھائی کہا گیا ہے۔

حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ مال و متاع کے بے جا صرف سے پرہیز کرو اور اعتدال اختیار کرو۔ کوئی قوم فقیر نہیں ہوتی جب تک وہ اعتدال پر رہے (کنزالعمال)

رسولؐ نے خرچ بے جا و بے دریغ کی مذموم عادت کے جس خوفناک نتیجے کی نشان دہی فرمائی ہے وہ افلاس و غربت ہے۔ وہ افلاس و غربت جس سے آج پاکستان دوچار ہے۔ ایک طرف ہم اپنی معاشی زبوں حالی اور چاروں طرف پھیلی ہوئی بے روزگاری کی وجہ سے قومی ابتلاء سے گذر رہے ہیں۔ دوسری طرف ہم اپنے طرز بود و باش' اپنے سامان زندگی' اپنی سماجی تقریبات اور شادی بیاہ میں شاہ خرچیوں سے اور روزمرہ کے معمولات میں جس اسراف و تعیش کا مظاہرہ کر رہے ہیں' اس کی مثال دنیا کی کسی خوش حال قوم اور معاشی طور پر فارغ البال لوگوں کی زندگی میں بھی نہیں ملتی!

ایرکنڈیشنر' قالین' فرش فروش' صوفہ سیٹ' ٹی وی اور وی سی آر ہمارے گھروں کے لوازم میں داخل ہو چکے ہیں۔ کاروں نے ہماری سڑکوں اور گلیوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ ہمارے مصنوعی تمول اور اسراف و تعیش کا اندازہ کرنا ہو تو کسی شادی ہال میں چلے جائیے اور دیکھیے کہ سارا ہال تیز و رنگین روشنی والے قمقموں سے جگ مگا رہا ہے' جبکہ گرد و پیش کی گلیوں میں اندھیرے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ غیر ملکی ملبوسات کی نمائش' بے حجابی کے مناظر' مخلوط نشستیں' فطری حسن کا مذاق اڑانے والے چہرے' نکاح کے وقت مرد و خواتین' دونوں کی آزادانہ موجودگی اور متحرک تصویر سازی' اسی ہال میں نظر آئیں گے۔ یہ مجمع صرف چند افراد پر مشتمل نہیں ہوتا' بلکہ وہ شادی شادی ہی تصور نہیں کی جاتی جس میں ہزار بارہ سو سے کم آدمی ہوں۔ کھانے کی میز پر آپ کے ساتھ اجنبی خواتین بھی ہوتی ہیں۔ اس خود نمائی اور خوش سلیقگی کی بھونڈی نمائش میں بد سلیقگی کے مناظر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ کھانے کی انواع و اقسام اتنی ہوتی ہیں کہ زبانی یاد نہیں رکھی جا سکتیں۔

جس پیمانے پر اللہ کی بخشی ہوئی نعمت کا ضیاع تقریبات میں ہوتا ہے' وہ ہماری بے حسی کی منہ بولتی تصویر پیش کرتا ہے۔ لاکھوں روپے صرف کرنے اور وقت اور کھانے کے ضیاع کے باوجود ہم مطمئن ہوتے ہیں کہ لوگ ہم پر رشک کریں گے اور معاشرے میں ہم عزت و اکرام کے مستحق ہوں گے۔ یہ اور بات ہے کہ لاکھوں کے مقروض ہو چکے ہوں گے۔ اگر یہ سب کچھ ہماری اپنی کمائی سے ہوا' تب بھی اللہ کی بخشی ہوئی دولت کو جس بے دردی اور مسرفانہ انداز سے ہم نے خرچ کیا' اس سے ہم نہ صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کے مرتکب ہوئے' بلکہ ہم نے اپنے آپ کو اور پوری قوم کو رسوا کیا اور اسلامی اخلاق و آداب کی دھجیاں بکھیر دیں۔

جشن منانے کا ہمارا یہ طرز عمل اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ ہم نہ دولت کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھتے ہیں' نہ امانت' نہ اس میں کسی کا حق تسلیم کرتے ہیں' نہ اس کے صرف کے محل و موقع کو پہچانتے ہیں اور نہ یہ جانتے ہیں کہ اسلام نے تفاخر سے منع کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جس نے سونے چاندی کے برتن میں یا ایسے برتن میں جس میں ان دونوں میں سے کسی کی ملاوٹ ہو' پانی پیا تو حقیقت میں وہ اپنے پیٹ میں جہنم کے انگارے ڈال رہا ہے (مشکوٰۃ)۔

اس حدیث میں صرف پینے کا ذکر ہے' مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے کھانے پینے اور برتنے کی وہ تمام چیزیں مراد ہیں جن سے امیرانہ ٹھاٹ باٹھ کا مظاہرہ ہو۔

اسلام یہ حکم نہیں دیتا کہ انسان اپنے نفس کی آسائش پر سرے سے کچھ خرچ ہی نہ کرے۔ جائز حدود کے اندر اس کی پوری اجازت ہے۔ البتہ بے جا اسراف سے اسلام سختی کے ساتھ روکتا ہے۔ اس سے دولت ضائع ہوتی ہے۔ چند دنوں میں ختم ہو جاتی ہے اور پھر انسان دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرتا پھرتا ہے۔

دولت مند کی دولت میں عزیزوں' مسکینوں' غریبوں اور مسافروں کا حق بتایا گیا ہے۔ قوم و ملک کا بھی حق بتایا گیا ہے۔ اشاعت علم کو بھی خیر کی

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

دیر ہے' اندھیر نہیں !

پنجاب پولیس کے سابق چیف' پدما بھوشن ایوارڈ یافتہ اور ملک کے انتہائی شہرت یافتہ پولیس افسر' کنول پال سنگھ گل کو بالآخر روین دیول بجاج مقدمے میں مجرم قرار دے دیا گیا ہے جس میں ان پر "ایک خاتون آئی اے ایس افسر کے معاملہ میں "بے جا مداخلت اور مجرمانہ حرکت" کا الزام عائد کیا گیا تھا۔

بھارت کی عدلیہ نے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ تاخیر سے سہی لیکن وہ انصاف فراہم کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ حالیہ فیصلے سے دو اہم باتیں کھل کر سامنے آگئی ہیں' پہلی یہ کہ قانون سے بالاتر کوئی شخص نہیں اور دوسری یہ کہ کوئی بھی مجرم سزا سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ اس سے یہ پرانی کہاوت بھی سچ ثابت ہوئی ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا شخص بھی عیب سے بالکل پاک نہیں ہو سکتا۔

چیف جوڈیشل مجسٹریٹ درشن سنگھ نے ۶ / اگست کو تاریخی فیصلہ سناتے ہوئے سابق اعلیٰ پولیس افسر کو آئی۔ پی۔ سی کی زیر دفعہ ۳۵۴ اور ۵۰۹ سزا کا مستوجب قرار دیا ہے۔ اگرچہ مسٹر گل کو دفعہ ۳۵۴ کے تحت ۳ ماہ قید بامشقت اور ۵۰۰ روپیہ جرمانہ اور دفعہ ۵۰۹ کے تحت دو ماہ عام قید اور ۲۰۰ روپیہ جرمانہ کی سزا سنائی گئی ہے' انہیں کل ۳ ماہ کی قید کاٹنی ہو گی کیونکہ دونوں سزائیں ایک ساتھ شروع ہوں گی۔ تاہم انہیں ہائیکورٹ میں اپیل کے لئے ایک ماہ کی مہلت دی گئی ہے۔ عدالت نے مسٹر گل کے دس ہزار روپے کا ذاتی بانڈ فراہم کرنے پر ان کی ضمانت منظور کر لی۔

مسٹر گل پر الزام عائد کیا گیا تھا کہ اس نے ۱۸ / جولائی ۱۹۸۸ء کو اس وقت کے فنانشل کمشنر (داخلہ) ایس۔ ایل۔ کپور کی طرف سے دیئے گئے ایک ڈنر میں مسز بجاج سے ناشائستہ حرکت کی تھی۔ مسز بجاج نے ۲۹ / جولائی ۱۹۸۸ء کو ان کے خلاف ایک ایف آئی آر درج کرا دی۔ چند ماہ بعد اس کے خاوند بی۔ آر۔ بجاج نے ایک فوجداری مقدمہ دائر کیا لیکن ہائیکورٹ نے ۲۹ / جولائی ۱۹۸۹ء کو ایف آئی آر خارج کر دی۔ مسز بجاج نے جدوجہد جاری رکھی اور آخر کار سپریم کورٹ نے ہائیکورٹ کا فیصلہ منسوخ کر کے چیف جوڈیشل مجسٹریٹ چندی گڑھ کو مسٹر گل کے اس جرم کی سماعت کا حکم دیا۔

مسٹر گل کو دہشت زدہ پنجاب میں حالات کو معمول پر لانے کی بنا پر جو بے پناہ شہرت حاصل ہو گئی تھی' جیل کی سزا پانے سے وہ سب خاک میں مل گئی ہے اور آئندہ زندگی میں مزید کامیابی سے ہمکنار ہونے کے ان کے خواب چکنا چور ہو کر رہ گئے ہیں۔ (بخت روزہ Radiance انڈیا)

دنیا امید پر قائم ہے؟

ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ مصر کی الازہر یونیورسٹی نے جدید خطوط پر اسلامی نظام کا ایک جامع خاکہ تیار کیا ہے جس میں قرآن و سنت کی روشنی میں اجتماعی زندگی کے جملہ پہلوؤں یعنی معاشرتی' معاشی اور سیاسی امور کو شق وار درج کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی نے اعلان کیا ہے کہ جو ملک بھی اس کی خواہش ظاہر کرے گا اسے اس کا مسودہ فراہم کر دیا جائے گا۔ دیکھیں کس ملک کو پہل کرنے کی سعادت حاصل ہوتی ہے سردست تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام مسلمان ممالک اس معاملے میں "خود کفیل" ہیں کیونکہ ابھی تک کسی ملک نے دلچسپی ظاہر نہیں کی' یہاں تک کہ خود مصر کی حکومت نے بھی نہیں۔

دنیا میں یقیناً ایسی زندہ قومیں موجود ہیں جن میں حق کو قبول کرنے کی صلاحیت معدوم نہیں ہوئی لہٰذا امید کرنی چاہئے کہ الازہر یونیورسٹی کی یہ محنت یکسر رائیگاں نہیں جائے گی۔

انداز حکمرانی!

اگر کہ مس بھٹو کا قصور یہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں ضرورت سے زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہیں تو اس کے مخالفین بھی کوئی کم قصوروار نہیں ہیں جو مس بھٹو صاحبہ کی مشکلات اور لڑائی لڑنے کی صلاحیت کا اندازہ کرنے میں غلطی کر جاتے ہیں۔ وہ تین بحران جو وسط گرما میں بہت بڑے طوفان کی شکل میں نمودار ہوئے تھے' یعنی مس بھٹو کی سپریم کورٹ سے لڑائی' سرے محل کا قصہ' جس کے بارے میں خیال تھا کہ اس نے حکومت کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور وہ جسے "قاتل بجٹ" کا نام دیا گیا' کہاں گئے یہ تینوں بحران؟

اپنی من مانی کرتے ہوئے' جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتی ہیں وزیر اعظم صاحبہ نے سپریم کورٹ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔ سپریم کورٹ کے مارچ میں صادر کردہ فیصلے سے متاثر ہونے والے ججوں کو حکومت نے ابھی تک معطل نہیں کیا' نہ حکومت کو اس کی کوئی جلدی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بے نظیر صاحبہ کو اس لڑائی کا غلط مشورہ دیا گیا تھا لیکن ان کا ثابت قدم رہنا اپنی جگہ ہے۔ اگر کوئی دباؤ پڑا ہے تو چیف جسٹس پر پڑا ہے۔

مانا کہ سپریم کورٹ کے سامنے بعض اہم معاملات زیر سماعت ہیں: بلدیاتی اداروں سے متعلق مقدمہ' اپنی سبکدوشی کے خلاف منظور وٹو کی اپیل' اور آفتاب شیرپاؤ کے خلاف نسیم ولی خان کی درخواست۔ ان مقدمات میں کوئی بھی فیصلہ سامنے آ سکتا ہے لیکن اس سے وزیر اعظم صاحبہ کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

یہ رویہ ایسا کوئی غیری حقیقت پسندانہ بھی نہیں جیسا کہ نظر آتا ہے۔ بے نظیر صاحبہ جانتی ہیں کہ اپنے بادبان کیسے درست رکھنے ہیں اس نے اپنے کٹھن تجربات کے ذریعے یہ سمجھ لیا ہے کہ فوج سے کبھی چھیڑ چھار نہیں کرنا۔ اسے معلوم ہے کہ مسلم لیگ (ج)' نواب زادہ نصراللہ خان اور مولانا فضل الرحمٰن جیسے لوگوں کے ناز نخرے برداشت کرنے میں کوئی عیب نہیں۔ پوپ کے بارے میں کوئی بحث ہو رہی ہوگی' سٹالن نے یہ سوال کر کے کہ "پوپ کے پاس کتنے ڈویژن ہیں؟" بحث ختم کر دی۔ چیف جسٹس کے پاس بھی ایک آدھ ڈویژن ہوتا تو بے نظیر صاحبہ کا رویہ بالکل مختلف ہوتا۔ (ایاز امیر۔ "ڈان")

تیری آواز...

لندن۔ ۲۱ اگست۔ عربی زبان کے اخبار القدس العربی نے کہا ہے کہ اسے اسامہ بن لادن کی طرف سے جاری کردہ ۱۲ صفحے کا بیان موصول ہوا ہے جو ۲۲/اگست کو افغانستان سے جاری کیا گیا۔ اس بیان میں اسامہ بن لادن نے کہا ہے کہ خلیج کی مسلمان ریاستوں میں امریکی "صلیبی" فوجوں کی موجودگی سے یہاں موجود دنیا کے سب سے بڑے تیل کے ذخیروں کو شدید خطرہ لاحق ہے' لہٰذا امریکی فوجوں کے خلاف اعلان جنگ کرنا چاہئے۔ (انٹرنیٹ)

مقام شرم

یہ خط انٹرنیٹ پر MSA News کے مدیر کو بھیجا گیا۔

"ایک غیر مسلم کی جانب سے استفسار:

.... خدا کی پرستش یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعظیم سے کیا حاصل جب کہ دنیا میں بے شمار افراد روزانہ بھوک اور بیماری سے مر رہے ہیں؟ کیا یہ بات عقل و منطق کی رو سے قابل فہم ہے کہ مذاہب تو نیکی اور انسانیت سے محبت کی تلقین کریں' لیکن مذہبی قائدین اور پیشوا اپنے مریدوں کے برعکس عیش و عشرت کی زندگی گزاریں؟ میں اسلام کے متعلق زیادہ معلومات نہیں رکھتا' لیکن عرب لیڈروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتا ہوں...."

عراق --- جرم ضعیفی کی سزا یا شامت اعمال!

امریکی ہوائی اور بحری افواج نے منگل (۳ ستمبر) کو جنوبی عراق میں ۲۷ کروز میزائل داغے۔ صدر بل کلنٹن نے وائٹ ہاؤس میں نامہ نگاروں کو بتایا کہ انہوں نے اس حملے کا حکم گزشتہ دنوں عراقی فوج کی کردوں کے علاقائی دارالخلافہ اربیل پر چڑھائی کرنے کے بعد دیا ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ عراق اور اقوام متحدہ کے درمیان "خوراک کے بدلے تیل" کا معاہدہ جس کے تحت عراق کو محدود مقدار میں تیل بیچ کر انسانی ضرورت کی اشیاء خریدنے کی اجازت دی گئی تھی روک دیا جائے گا۔ بغداد سے عراق کے ڈپٹی پرائم منسٹر طارق عزیز نے CNN کو بتایا کہ امریکی حملہ بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ انہوں نے کہا کہ صدر کلنٹن کا تبصرہ صورت حال سے لاعلمی پر مبنی ہے۔

عالمی سطح پر امریکی حملے کے بارے میں ملے جلے رد عمل کا اظہار کیا گیا ہے۔ چین اور روس نے اس پر گہرے دکھ کا اظہار کیا۔ برطانیہ اور جرمنی نے امریکہ کو مکمل حمایت کا یقین دلایا جبکہ فرانس نے سرد مہری سے کام لیا۔ یورپ کی طرح عالم عرب بھی کسی ایک رائے کا حامل نہیں تھا۔ عرب لیگ نے صدام حسین کے ساتھ سختی کے ساتھ معاملہ کرنے کو ناگزیر کہا' اگرچہ لیگ کے تمام ممبر اس سے متفق نہیں تھے۔ شام اور مصر نے اپنے دکھ کا اظہار کیا۔ ایران نے صدام حسین پر امریکہ کو حملے کا بہانہ فراہم کرنے پر نکتہ چینی کی۔ اس نے امریکہ پر بھی الزام عائد کیا کہ وہ کردوں کا بہانہ کر کے اپنا رعب جمانا چاہتا ہے۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ کروز میزائلوں کا نشانہ جنوبی عراق کو بنایا گیا ہے (جبکہ عراق پر گڑبڑ کرنے کا جو الزام عائد کیا گیا ہے وہ شمالی عراق سے متعلق تھا) نیز جنوبی عراق میں قائم ممنوعہ فضائی علاقے "نو فلائی زون" میں توسیع سے معلوم ہوتا ہے کہ حملے کا مقصد ایک طرف خلیج کے تیل پیدا کرنے ممالک پر اپنے تسلط کا مظاہرہ اور دوسری طرف روس اور چین سے لے کر یورپی برادری کے رکن ممالک تک اور عراق کے پڑوسی ممالک (ترکی' ایران اور شام) کو بغداد کے ساتھ تعلقات بڑھانے سے خبردار کرنا ہے۔ اس کے علاوہ "تیل کے بدلے خوراک" کے سمجھوتے پر ضرب لگا کر بطرس غالی کی اگلی مدت کے لئے سیکرٹری جنرل کے عہدہ کی امیدواری کی حوصلہ شکنی کرنا ہے۔

شمالی عراق میں کردوں کی "حفاظت" محض ایک بہانہ ہے۔ نیٹو کے حلیف ترکی اور نیٹو کے حریف ایران' دونوں جب چاہتے ہیں کردوں پر چڑھ دوڑتے ہیں' مگران کو کوئی نہیں پوچھتا۔ خود کرد ایک دوسرے کو قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ لیکن عراق کو اپنے علاقے میں کارروائی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ OO

نام نہاد متحدہ اپوزیشن کے پاس کوئی انقلابی پروگرام نہیں

جماعت اسلامی کو "انقلاب بذریعہ احتجاج" کے نعرے سے تازہ حیات ملی ہے

سابقہ تحریکوں کی نسبت اس مرتبہ اسلام پر زور کم نظر آتا ہے

محبوب الحق عاجز

متحدہ اپوزیشن کے سولہ جماعتی اتحاد کی "حکومت ہٹاؤ تحریک" جو زور و شور سے جاری تھی' اس میں حالیہ بارشوں اور سیلاب کے باعث عارضی طور پر کچھ نرمی آگئی تھی' تاہم اب ایک مرتبہ پھر سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ بارش سے متاثرین اور سیلاب زدگان کی امداد کے ذریعے عوامی حمایت کے حصول کی کوششیں تیز تر کر دی گئی ہیں۔

اتحاد میں شامل اپوزیشن کی سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ دو سال قبل بھی پیپلز پارٹی گورنمنٹ کے خلاف اسی نوعیت کی "تحریک نجات" چلا چکی ہے۔ تاہم حکومت سے نجات نہ مل سکی۔ اب ایک بار پھر سیاسی کھلاڑی عملی جدوجہد پر کمربستہ ہو کر میدان عمل میں کود پڑے ہیں۔ایک طرف حکومت ہٹاؤ تحریک کے لئے رائے عامہ کو ہموار کیا جا رہا ہے' اور دوسری طرف صدر سے اسمبلیوں کو توڑنے' عبوری حکومت قائم کرنے اور نئے انتخابات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ یہ تحریک اگرچہ اس وقت چلائی جا رہی ہے جبکہ عوام کمر توڑ مہنگائی' ناروا اور بے جا ٹیکسوں کے بوجھ' حکومتی اللوں تللوں اور امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورتحال کے باعث سخت پریشان ہیں' اور ان میں حکومت کے خلاف بے پناہ نفرت پائی جاتی ہے۔ اس کے باوجود یہ تحریک بھی سابقہ تحریک نجات کی طرح ناکام ہوتی نظر آ رہی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگرچہ اتحاد میں شامل جماعتیں "حکومت ہٹاؤ" کے ایک نکاتی ایجنڈے پر متفق ہیں' لیکن ان میں باہمی اعتماد اور افہام و تفہیم کا فقدان ہے۔ جس کی وجہ سے تحریک کے اندر جوش و جذبے کی کمی صاف نظر آ رہی ہے۔ اتحاد میں شامل جماعتوں کا موقف یہ ہے کہ تحریک کے لئے مسلم لیگ سے تعاون بعض بنیادی اصولوں پر اتفاق رائے اور اپنے جماعتی مفادات کو مدنظر رکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایم کیو ایم کا مطالبہ ہے کہ پہلے الطاف حسین اور اس کے ساتھیوں پر قائم مقدمات کے واپس لینے کی یقین دہانی کرائی جائے جبکہ لیگی قیادت کہتی ہے کہ یہ مسائل پیچیدہ ہیں' انہیں وقت آنے پر حل کر لیا جائے گا۔ فی الحال ایم کیو ایم "حکومت ہٹاؤ" کے ایجنڈے کے تحت حکومت گرانے میں تعاون کرے۔ یہی معاملہ بعض دینی جماعتوں کا ہے۔ جمعیت علمائے اسلام (س) جمعیت علمائے پاکستان (ن) اور فقہ جعفریہ کو تحریک کی کامیابی کی صورت میں نئے انتخابات میں انہیں دی جانے والی سیٹوں پر اختلاف ہے۔ ان جماعتوں کی مشکل یہ ہے کہ جب تک مسلم لیگ سے سیٹوں پر کوئی معاہدہ نہیں ہو جاتا' وہ تحریک میں سرگرم حصہ نہیں لے سکتیں۔ بعض سیاسی حلقے تو جماعت اسلامی کے متعلق بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ امیر جماعت' قاضی حسین احمد نواز شریف سے اتحاد کے لئے تیار ہیں' انہیں صرف سیٹوں پر اختلاف ہے۔ ان کا مطالبہ تیس سیٹوں کا ہے مگر خیال ہے کہ وہ بیس پر بھی راضی ہو جائیں گے۔

تحریکیں قیادت کے زور پر چلتی ہیں۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو موجودہ تحریک مفلسی کا شکار نظر آتی ہے' کیونکہ ابھی تک باوجود کوششوں کے کسی متفقہ قیادت کا فیصلہ نہیں کیا جا سکا۔ مسلم لیگ اور اس کی حلیف جماعتیں نواز شریف کو قائد قرار دے رہی ہیں کیونکہ بقول ان کے مسلم لیگ سب سے بڑی اپوزیشن جماعت ہے اور اس کا ایک موثر ووٹ بینک ہے۔ یہاں تک کہ مجموعی ووٹوں کے اعتبار سے تو اسے حکمران جماعت پیپلز پارٹی پر بھی برتری حاصل ہے۔ اس کے برعکس بعض دوسری جماعتیں نواز شریف کی قیادت تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ ان میں سرفہرست جماعت اسلامی ہے۔ جماعت کے ذرائع کا کہنا ہے کہ اگرچہ نواز شریف کو عددی برتری حاصل ہے اور قومی اسمبلی میں نشستیں بھی مسلم لیگ کی زیادہ ہیں' لیکن کسی تحریک کی قیادت کے لئے یہ تو کوئی معیار نہیں ہے۔ ان کے نزدیک ایک بہترین قائد کے لئے لازمی ہے کہ وہ جانی و مالی ہر قسم کی قربانیاں پیش کر سکے' عوام کو متحرک کر سکے' اور ثابت قدمی اور استقامت کا مظاہرہ کر سکے۔ اور یہ صفات صرف امیر جماعت میں موجود ہیں۔ لہٰذا تحریک کی قیادت انہی کا حق ہے۔ نیز جماعت کے پاس ایک سٹریٹ پاور ہے۔ اس کے کارکن قربانیاں دے سکتے ہیں۔ وہ تنظیمی طاقت سے مسلح ہیں' جس کے بغیر کوئی بھی تحریک منزل مراد سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ قیادت کا یہ اختلاف قاضی صاحب کے اس بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ نہ میں نواز شریف کو قائد مانتا ہوں' نہ وہ میری قیادت تسلیم کرتے ہیں۔

مسلم لیگ کو اندیشہ ہے کہ تحریک کی قیادت اگر قاضی صاحب کو سونپ دی گئی تو وہ اپنے منظم کارکنوں اور مسلم لیگ کی افرادی قوت کے بل بوتے پر "حکومت ہٹاؤ تحریک" کو کامیاب کر کے سارا کریڈٹ خود حاصل کر لیں گے' اور مستقبل کی سیاست میں جماعت اسلامی ایک موثر پارٹی کے طور پر سامنے آ کر مسلم لیگ کے لئے خطرہ ثابت ہو گی۔ جماعت اسلامی کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ نہ تو حکومت ہٹاؤ تحریک سے الگ تھلگ رہنا چاہتی ہے' کیونکہ اسے اندیشہ ہے کہ ایسا کرنے سے عوام میں اس تاثر کو مزید تقویت ملے گی کہ پیپلز پارٹی کو برسراقتدار لانے کی اصل ذمہ دار وہی ہے۔ اور نہ ہی وہ یہ چاہتی ہے کہ قربانیاں ہمارے کارکن دیں' محنت و مشقت ہم کریں' تحریک کی کامیابی میں ہمارا ایک موثر رول ہو' لیکن قیادت کا تاج نواز شریف اپنے سر پر سجا کر مستقبل کے وزیر اعظم ثابت ہوں۔ چنانچہ جماعت بڑے محتاط انداز سے تحریک کے ساتھ چل رہی ہے۔

اگر تحریک کی قیادت اس کے حوالے کی جاتی ہے فبہا' ورنہ وہ اپنی تحریک کو --- جو اس نے موجودہ تحریک سے بھی پہلے بڑے منظم انداز میں چلا رکھی ہے ---- بڑی سرعت اور منصوبہ بندی کے ساتھ آگے بڑھانا چاہتی ہے۔ چنانچہ اب جبکہ نواز شریف نے اسلام آباد مارچ کا سگنل دیا ہے' اس سے پہلے ہی قاضی حسین احمد ۲۷ ستمبر کو کراچی میں دس ملین افراد کے نکلنے کا اعلان کر چکے ہیں' اور اسلام آباد مارچ کے لئے وہ اکتوبر میں کسی بھی وقت اعلان کرنے والے ہیں۔

موجودہ تحریک حکومت کے خاتمے کے لئے موزوں پیکج بھی عوام کے سامنے پیش نہیں کر سکی۔ تحریکی قیادت اگرچہ وزیراعظم کے سرے سیکنڈل کو اچھال کر رائے عامہ کو ہموار کرنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن عوام تو اپنے معاشی مسائل' مہنگائی' بے روزگاری اور بڑھتے ہوئے ٹیکسوں وغیرہ کا ٹھوس حل چاہتے ہیں۔

ملک کی داخلہ اور خارجہ پالیسی کے حوالے سے بھی متحدہ اپوزیشن کے پاس کوئی انقلابی پروگرام نہیں ہے' جو دور رس نتائج کا حامل ہو اور جس میں ملک کا سنجیدہ اور قوم و وطن کا درد رکھنے والا طبقہ دلچسپی محسوس کرے۔ ملک کو درپیش جاگیردارانہ نظام' نئے صوبوں کا قیام' کالا باغ ڈیم کی تعمیر' مسئلہ کراچی اور اس طرح کے بعض دوسرے مسائل میں حکومتی موقف اور موجودہ تحریک کے نقطہ نظر میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اسی طرح خارجی میدان میں مسئلہ کشمیر کے پائیدار حل' ایٹمی پروگرام کو جاری رکھنے' اسرائیل کو تسلیم نہ کرنے' اور امریکہ اور آئی ایم ایف کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے بارے میں بھی متحدہ اپوزیشن نے کسی نئی حکمت عملی کا عندیہ نہیں دیا' بقول چیف آف آرمی سٹاف جنرل جہانگیر کرامت "قومی پالیسیاں ایک دو دن میں نہیں بنتیں" اگر ایسا ہی ہے تو پھر ایسی تحریکوں کا فائدہ ہی کیا ہے؟

موجودہ تحریک کا ایک کمزور پہلو یہ بھی ہے کہ اگرچہ تحریک کا آغاز بڑے زور و شور سے کر دیا گیا ہے لیکن ابھی تک تحریک کا کوئی واضح لائحہ عمل تشکیل نہیں دیا جا سکا۔ بنیادی طور پر یہ احتجاجی تحریک ہے' لیکن مسلم لیگ کے ڈپٹی پارلیمانی لیڈر گوہر ایوب اب تبدیلی بذریعہ پارلیمنٹ کا فارمولا پیش کر رہے ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ یہ خالصتاً احتجاجی تحریک یا نہیں۔ یہ بھی واضح نہیں ہے کہ تحریک کو کن خطوط پر آگے بڑھایا جائے گا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی مختلف فیہ ہے کہ تحریک کے نتیجے میں اگر حکومت استعفاء دے اور نئی عبوری حکومت قائم ہو ---- جیسا کہ اس تحریک کا مطالبہ ہے ---- تو اس عبوری حکومت کی نوعیت' مدت اور دائرہ کار کیا ہو۔ نئے انتخابات کے سلسلہ میں بھی اختلافات موجود ہیں۔ مسلم لیگ اور بعض دوسری اتحادی جماعتوں کے نزدیک ایک عبوری حکومت تشکیل دی جائے جو نوے دن کے اندر اندر انتخابات کا انعقاد کرے اور بس! جبکہ جماعت اسلامی کا کہنا ہے کہ ایسی عبوری حکومت قائم کی جائے جو صالح افراد پر مشتمل ہو' جو نئے انتخابات کے انعقاد سے قبل تمام سیاستدانوں کا احتساب کرے۔ اس کے بعد جو لوگ آئین کے آرٹیکل ۶۲ کے معیار پر پورے اترتے ہوں' صرف انہیں الیکشن لڑنے کی اجازت دی جائے۔ یعنی وہ لوگ جو صالح ہوں' کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرنے والے ہوں' عوام میں نیک مشہور ہوں۔ اس صورتحال سے ظاہر ہے کہ ابھی تک لائحہ عمل کا بھی واضح تعین نہیں ہو سکا' اور یہ امر تحریک کی قیادت میں قوت فیصلہ کی کمی کا غماز ہے' اور یہ صورتحال تحریکوں کے لئے ناکامی کا باعث ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اسمبلیوں سے استعفوں کے معاملے میں بھی' باخبر ذرائع کہتے ہیں کہ' مسلم لیگ میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔

سابقہ تحریکوں کے برعکس موجودہ تحریک میں نفاذ اسلام پر بھی زیادہ زور (emphasis) نہیں ہے۔ اگرچہ ایک آدھ بار تحریک کے مبینہ قائد نواز شریف نے خلافت راشدہ کا نظام لانے کا نعرہ مستانہ بلند ضرور کیا ہے' لیکن ان کی سابقہ "اسلام دوستی" کے پیش نظر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اس خلافت "راشدہ" کی شکل کیا ہو گی۔ اسی ڈر سے دینی تحریکوں میں ان کے ساتھ کام کرنے اور تعاون کے لئے آمادگی نظر نہیں آ رہی ہے۔ اس اندیشے کے پیش نظر قاضی صاحب نے واضح طور پر یہ کہہ دیا ہے کہ "ہمارا کوئی اتحاد نہیں ہے ہم صرف موجودہ حکومت کو گرانے پر "متفق" ہیں"۔

ان حالات و واقعات سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ موجودہ "حکومت ہٹاؤ تحریک" قیادت کے بحران' نفاذ اسلام میں عدم دلچسپی' اعتماد باہمی کی کمی' غیر واضح اور مبہم لائحہ عمل' اتحاد و یکجہتی کے فقدان' انقلابی داخلہ و خارجہ پالیسی کی عدم موجودگی اور عوام کے معاشی مسائل کے حل کے لئے ہنگامی پروگرام نہ رکھنے کے سبب کامیابی کی منزل سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ اور قرائن یہی بتا رہے ہیں کہ سولہ جماعتی تحریک متفرق ہی نہیں بلکہ متضاد خیالات کی حامل جماعتوں کے افتراق کے باعث خود ہی دم توڑ دے گی' اور اس کا حشر بھی تحریک نجات سے یکسر مختلف نہ ہو گا۔ چنانچہ تحریک کے ۱۴/ اگست کراچی کے جلسہ اور ۲۸/ اگست کے پشاور کے جلسہ اور ریلی سے یہی حقیقت دکھائی دیتی ہے۔ کراچی کے جلسہ کے بارے میں بڑی کامیابی کی پیشین گوئی کی گئی تھی لیکن بعض جماعتوں خصوصاً ایم کیو ایم کے ارکان کی عدم دلچسپی کے باعث شرکاء کی تعداد انتہائی کم تھی۔ اس اعتبار سے اس جلسہ کو کامیاب قرار نہیں دیا سکتا۔ پشاور ریلی اور جلسہ میں بھی بعض دینی رہنماؤں کی عدم شرکت کے باعث ان جماعتوں کے رفقاء کی حاضری کم تھی۔

اب تحریک کی قیادت کے لئے ضروری ہے کہ ان مسائل کے تدارک کی کوشش کرے تب ہی تحریک کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ لیکن سب سے اہم بات ہمارے نزدیک یہ ہے کہ موجودہ سیاسی منظر خاص طور پر دینی جماعتوں کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔

دینی جماعتیں اگر اس بنیاد پر تحریک میں شامل ہوئی ہیں کہ اس کے ذریعے نفاذ اسلام کی منزل تک رسائی حاصل ہو سکے گی تو ہمارے نزدیک یہ ع "ایں خیال است و محال است و جنوں" والی بات ہے۔ اس لئے ملکی تاریخ کے پچاس سالہ تجربہ کے بعد بھی جو لوگ اس انداز سے سوچتے ہیں' وہ حقائق کی دنیا میں نہیں' خوابوں کی دنیا میں بستے ہیں۔ مقام غور ہے کہ ایسی تحریک جس میں دینی و سیکولر ہر دو طرح کی جماعتیں شامل ہوں اور ان کا بھی غالب عنصر نہ صرف سیکولرازم کا حامی ہو بلکہ عملاً اسلام کا دشمن بھی ہو' اس کے ذریعے نفاذ اسلام کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ ہمارے لئے تازیانہ عبرت ہے۔ وہ عظیم تحریک' جو متحد تھی۔ تمام مذہبی سیاسی جماعتیں اس میں شامل تھیں اور جس کا نعرہ بھی خالصتاً "نظام مصطفیٰ" کا نعرہ تھا' لیکن اصل قیادت (برائے نام قیادت انہیں) چونکہ سیکولر جماعتوں کے پاس تھی' اس لئے انتہائی کامیابی کے ساتھ چلنے کے بعد جب فصل کاٹنے کا وقت آیا تو صاف معلوم ہو گیا کہ یہ نظام مصطفیٰ کی نہیں اپنی بھٹو تحریک تھی۔

لیکن اگر دینی جماعتوں کو اس تحریک سے نفاذ اسلام کی توقع نہیں ہے تو یہ امر خوش آئند ہے کہ ان میں حقیقت بینی کا رجحان پیدا ہو رہا ہے لیکن ایسی صورت میں تحریک میں شمولیت کا کیا مطلب؟ پھر علمائے کرام سیکولر قوتوں کا ساتھ کیوں دے رہے

ہیں؟ زیادہ سے زیادہ سیٹوں کے حصول کا مطالبہ کیوں کیا جا رہا ہے؟ قیادتیں کیوں مانگی جا رہی ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ دینی قوتوں کے اس طرز عمل سے عوام میں اس سوچ کو مزید تقویت ملے گی کہ دینی رہنما محض اقتدار کی خاطر بھاگ دوڑ کر رہے ہیں' اسلام کے لئے نہیں! تو خدارا اس سوچ کو پروان نہ چڑھنے دیجئے۔

ایسے میں دینی جماعتوں کے لئے ایک ہی راہ عمل ہے۔ وہ یہ کہ وہ اپنے تمام تر سیاسی اختلافات کو تج کر کے' سیکولر قوتوں کو طلاق دے کر اور باہم متحد و منظم ہو کر انقلابی اور احتجاجی سیاست کے ذریعے نفاذ اسلام کی جدوجہد کا آغاز کریں۔ صرف اسی راستے سے تبدیلی کی امید کی جا سکتی ہے۔ انقلابات کی تاریخ اسی انقلابی طریقہ کی رہنمائی کرتی ہے۔ روس کا اشتراکی انقلاب' چین کا اشتمالی انقلاب' فرانس کا جمہوری انقلاب اور حالیہ ایرانی انقلاب اسی حقیقت کے مظاہر ہیں۔ اور پھر وطن عزیز میں ضیاء الحق کے دور اقتدار میں اہل تشیع کو خود کو زکوٰۃ آرڈی نینس سے مستثنیٰ قرار دینے کے مطالبے میں کامیابی اسی احتجاج اور پارلیمنٹ کے گھیراؤ کے ذریعے ممکن ہوئی تھی۔

انقلاب بذریعہ احتجاج کے حوالے سے جماعت اسلامی کا راولپنڈی میں حکومت کے خلاف حالیہ احتجاج نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر جماعت کو حیات تازہ ملی ہے تو اسی احتجاج سے' اسی احتجاج سے عوام میں جماعت کے متعلق نرم گوشہ پیدا ہوا ہے۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اگر اس نوعیت کی کوئی تحریک اٹھے بشرطیکہ وہ منظم اور پرامن ہو' تو یقیناً عوام نہ صرف اس کی حمایت کریں گے بلکہ عملاً ہر قسم کی قربانیاں بھی پیش کریں گے۔

انقلابی جدوجہد کے حوالے سے موجودہ تناظر میں جمعیت علمائے اسلام کے نائب امیر سینیٹر حافظ حسین احمد کا وہ بیان بڑا اہم ہے جو روزنامہ پاکستان کی ۳۱/ اگست کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے واضح طور پر کہا ہے کہ :

"جماعت اسلامی مذہبی جماعتوں سے مل کر انقلابی سیاست کرے تو جے یو آئی آئندہ الیکشن نہیں لڑے گی"۔

اس سے اب کچھ توقع پیدا ہوئی ہے کہ دینی جماعتوں میں اب یہ سوچ پروان چڑھ رہی ہے کہ انتخابی کی بجائے انقلابی راستے کو اختیار کیا جائے اور سیکولر قوتوں کا زینہ بننے کی بجائے باہمی اتحاد اور تعاون کو فروغ دے کر نفاذ اسلام کی راہ ہموار کی جائے۔ اللہ کرے یہ سوچ مزید پختہ ہو' اور رجال دین اسلام کی غربت کے دور میں وقت کی رفتار اور کفر کی یلغار کے پیش نظر باہم متحد و منظم ہو کر انقلابی راستے سے نفاذ اسلام کی جدوجہد کا آغاز کریں۔ اور یوں دین کے قیام کی منزل کو حاصل کیا جا سکے۔ لیکن اگر رجال دین نے ایسا نہ کیا اور سیکولر قوتوں کا سہارا بنتے رہے تو پھر بقول اقبال ؎

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کے دو خطابات پر مشتمل بعنوان

عیسائیت اور اسلام

کتابی شکل میں دستیاب ہے

عمدہ طباعت' صفحات ۵۶ قیمت ۸ روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

دینی اور دنیوی تعلیم کا حسین امتزاج

قرآن کالج لاہور

اعلان داخلہ

برائے بی اے (سال اول)' اور

ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس

- اس سال دوسرے کالجوں سے ایف اے پاس کرنے والے طلبہ کے لئے بی اے میں براہ راست داخلہ کا اہتمام کیا گیا ہے۔
- بی اے کے باقاعدہ داخلے ایف اے کے نتائج کے بعد دس روز کے اندر ہوں گے۔ تاہم داخلہ کے خواہشمند طلبہ ۱۰ ستمبر سے شروع ہونے والی بی اے (سال اول) کی کلاس میں پروویژنل طور پر شامل ہو سکتے ہیں۔
- ایک سالہ رجوع الی القران کورس کے داخلے ستمبر کے آخری ہفتے میں ہوں گے۔
- بی اے اور ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس' ہر دو کلاسز کے لئے ایک ایک میرٹ سکالرشپ کی سہولت موجود ہے۔
- کالج میں کمپیوٹر کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

پراسپکٹس اور داخلہ فارم کیلئے دس روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کریں۔

المعلن : پرنسپل قرآن کالج' اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن لاہور

فون : 8-5833637

گوشہ چمن

پاکستان میں افراتفری اور انتشار کی جو کیفیت قومی زندگی کے ہر شعبے میں دکھائی دے رہی ہے اس کی سنگینی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ لوگ آسانی سے وہ سب کچھ ہضم کر رہے ہیں جس کا بیس بائیس سال قبل تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مثلاً یہی سپاہ محمد اور سپاہ صحابہ کی ترکیب۔ شاید اسی موقع کے لئے علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

گلہ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
کسی بت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

کیفیت یہ ہے کہ (معاذ اللہ) محمد ﷺ اور صحابہ ؓ کی "فوجیں" آپس میں لڑ رہی ہیں' ایک دوسرے کے مجاہدین کو خاک و خون میں غلطاں کر رہی ہیں اور کوئی انہیں روکنے اور ٹوکنے والا نہیں کہ وہ اپنے کاروبار دنیوی میں رسول ﷺ اور صحابہ ؓ کو نعوذ باللہ دست و گریباں دکھانے کی گستاخی کرنے سے باز آ جائیں۔ ظاہر ہے جب معاشرہ اس حد تک بے حس ہو جائے تو پھر اس کے متعلق دو ہی باتیں ممکن ہیں' یا تو وہ معاشرہ ختم ہو چکا ہے اور قدرت نے اپنے اس حصہ ارض کی تزئین و تشکیل نو کے لئے کسی اور کو منتخب کر لیا ہے یا پھر یہ بے حسی کسی خوفناک طوفان کا دیباچہ ہے۔ اس خوفناک انقلاب کے نتیجے میں تاتار و ترک برآمد ہوں گے یا فرڈی نینڈ؟ اس سوال کا جواب قدرت ہی کو معلوم ہے اور وہی اس کا اعلان کرنے کی مجاز بھی ہے۔ اس قوم کو سنبھلنے کے بڑے مواقع دیئے گئے لیکن بدقسمتی سے اس نے کسی بھی موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ ہر "موقع" کو اس نے اپنا حق سمجھا' قدرت کا احسان نہیں اور ہر "موقع" کو اس نے دانستہ طور پر ضائع کر دیا۔ قرارداد لاہور سے قرارداد دہلی تک' قرارداد مقاصد سے معرکہ ستمبر ۶۵ء تک اور وہاں سے سقوط مشرقی پاکستان تک ایک نہیں سنبھلنے کے لئے سینکڑوں مواقع ملے۔ پھر جہاد افغانستان سے کشمیر کی جنگ آزادی تک یہ اضافی مواقع تھے جو اس قوم کو دیئے گئے لیکن اس نے ان تمام مواقع کو ضائع کرنے میں کوئی دیر نہیں کی۔ دنیا کی یہ وہ دلچسپ اور سنگدل قوم ہے جو خدا اور شیطان دونوں کو دھوکا دینے میں خود کو ماہر سمجھتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ یہ قوم یزدان و اہرمن کے دو طرفہ تھپیڑوں کی زد میں بے حس ہو چکی ہے۔

جاگیرداری

اثرات مرتب ہوں گے لہٰذا اس ذہنیت کا جڑ پکڑنا قدرتی بات تھی۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو جس "جاگیردارانہ" ذہنیت کا آج ہمارا معاشرہ شکار ہے وہ صرف زمینی رقبے کی وسعت کے ساتھ ہی منسلک نہیں ہے بلکہ یہ مرض عمومی رخ اختیار کر گیا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے ہاں کے تاجر اور صنعت کار طبقہ کو لے لیجئے۔ کتنے ایسے خاندان ہوں گے جو یہ دعویٰ کر سکیں گے کہ انہوں نے یہ "ترقی" محض اپنی کاروباری صلاحیت اور کھلی مسابقت کی بنا پر حاصل کی ہے۔ سیاسی بنیادوں پر لائسنسوں اور قرضوں کا اجراء کبھی بھی یہاں راز کی بات نہیں رہی۔ اسی طرح حکومت کی طرف سے خام مال پر چھوٹ' زرمبادلہ کا ہیر پھیر اور سب سے بڑھ کر ایک محفوظ مارکیٹ کی فراہمی' یہ وہ آلات ہیں جن کے بغیر اس ملک میں کسی کاروبار کا تصور ہی بے معنی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جاگیردار ہوں یا صنعت کار اور تاجر یا نوکر شاہی حتیٰ کہ عام حکومتی کارندے' ہر جگہ اسی جاگیردارانہ ذہنیت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

اب آخری اور اہم ترین بات یہ کہ اس صورتحال کی اصلاح کیسے کی جائے' اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ سب سے آسان حل جس کا ذکر اکثر ان الفاظ میں سننے میں آتا ہے کہ "اس سے تو انگریز کی غلامی اچھی تھی" یہ ہم اپنی آزادی سے دستبردار ہو کر کسی توانا باصلاحیت اور بااصول قوم کی محکومیت اختیار کر لیں ع میں باز آیا محبت سے اٹھا لو پاندان اپنا! مگر

کسی کو اب ہمیں غلام بنانے کی جلدی نہیں پڑی' کہتے ہیں انہیں "آزادی" کے مزے لوٹنے دو۔ جو اصل حل ہے وہ چونکہ انتہائی مشقت طلب اور طویل جدوجہد کا متقاضی ہے اس لئے اکثر طبیعت ادھر نہیں آتی' پھر بھی اسے بیان کر دینا خیر سے خالی نہیں' اس لئے کہ ع "شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات"

چنانچہ حل یہ ہے کہ ایسے لوگ جو حق کے طالب اور ظلم سے اجتناب کے متمنی ہوں' کسی ایک امیر کی قیادت میں منظم ہو کر طاقت بنیں اور جب یہ طاقت مضبوط ہو تو میدان میں آ کر باطل سے ٹکرا جائیں۔

ع اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے۔

لمحہ فکریہ

مد قرار دیا گیا ہے۔ اس روشنی میں ہمیں اس کا جائزہ لینا چاہیے کہ کیا ہمارے اس مسرفانہ تمدن سے ہماری قومی بنیاد مستحکم ہو رہی ہے یا کھوکھلی ہو رہی ہے؟ آج ہم علم' ٹیکنالوجی اور معیشت میں دنیا کی تقریباً تمام قوموں سے پیچھے ہیں۔ ہمارے معاشرتی آداب واطوار میں بے حیائی اور فحاشی نمایاں ہے۔ آخر ہم کیوں اجتماعی خودکشی کی طرف بڑھ رہے ہیں؟

پاکستان کا دولت مند طبقہ دولت کے سخت نشے میں ہے۔ اسے اس کا مطلقاً احساس نہیں ہے کہ اس کی دولت میں ان کا بھی حصہ ہے کہ جو دولت سے محروم ہیں اور عسرت کی زندگیاں گزار رہے ہیں۔ دولت مند کی دولت میں ان نونہالوں کا بھی حصہ ہے کہ جو تعلیم و تربیت سے محروم ہیں۔ یاد رکھیے کہ اسی غفلت کی وجہ سے ہم کفار و مشرکین کی جارحیت کا نشانہ بن رہے ہیں۔

بقیہ : مکتوب کراچی

نے ایک مقامی اخبار کو انٹرویو کے دوران دیا ہے جس کا متن یہ ہے۔

"جی ایم سید کے بڑے صاحبزادے سید امداد محمد شاہ نے اعتراف کیا ہے کہ مہاجروں کے خلاف لڑائی کی ابتدا سندھیوں نے کی اور اس مقصد کے لئے ایجنسیوں نے کچھ قوم پرست نوجوانوں اور ڈاکوؤں کو استعمال کیا۔ ——— انہوں نے کہا ہے کہ میں نے ۳۰ ستمبر کے واقعے کے بعد اس وقت کے چیف سیکرٹری سندھ مسعود عالم رضوی سے کہا تھا کہ ——— اس واقعہ میں ملوث ڈاکو جانو آرائیں جتوئی اور دیگر کو چار روز قبل عدالت سے ضمانت پر رہا کیا گیا اور سینکڑوں افراد کو قتل کرایا گیا ہے۔ ——— انہوں نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ سندھیوں اور مہاجروں کے مفادات ایک ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ماضی کی تلخیاں کم ہو رہی ہیں اور وقت کا مرہم زخموں کو مندمل کر رہا ہے" ——— ایم کیو ایم کے قیام کے بعد سے اب تک کے حالات کے نتیجے میں مہاجر ایک بند گلی میں کھڑے ہیں۔

اب بھی وقت ہے کہ مہاجروں کے اندر سے ایک ایسی قیادت ابھرے جو سندھی مہاجر یکجہتی کی علامت بن جائے۔

جس کے گھر میں چار پیسے آجائیں وہ "جاگیردار" بن جاتا ہے

جاگیرداری کے مسئلے کو زرعی شعبے کی مجموعی خراب صورتحال کے ساتھ گڈمڈ کرنا درست نہیں

معاشرے میں ایک طرف سرکش حکمران طبقہ ہے اور دوسری طرف چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے عوام

ابن صالح

ان دنوں بعض قومی اخبارات میں یہ بحث چل رہی ہے کہ آیا پاکستان میں اس وقت جاگیرداری نظام موجود ہے یا نہیں؟ کچھ عرصہ قبل وزیراعظم صاحبہ نے بھی فرمایا تھا کہ یہاں کوئی جاگیردار نہیں۔ ایک صاحب نے لکھا ہے کہ شروع دن سے زرعی شعبے کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک روا رکھا گیا۔ قائداعظم کے قریبی ساتھیوں میں جو لوگ شامل تھے ان میں سے بیشتر کا تعلق تجارت کے پیشہ سے تھا اس لئے ساری توجہ تجارت اور صنعت کو ترقی دینے پر مرکوز رہی اور زراعت کو جس پر ملک کی ۸۰ فیصد آبادی کا انحصار تھا' نہ صرف نظر انداز کر دیا گیا بلکہ زرعی پیداوار کی قیمتوں کو نچلی سطح پر رکھ کر صنعت و تجارت کو پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا گیا جس سے دیہی آبادی مزید بدحالی کا شکار ہوتی چلی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آبادی کا رخ دیہات سے شہروں کی طرف ہو گیا جس نے طرح طرح کے معاشرتی مسائل کو جنم دیا۔

اگر دیکھا جائے تو یہ بات سرے سے بے بنیاد نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک جاگیرداری کے مسئلے کا تعلق ہے اسے خواہ مخواہ زرعی شعبے کی مجموعی خراب صورت حال کے ساتھ گڈمڈ کرنے کی کوشش کرنا بھی درست نہیں۔ جاگیرداری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ گزشتہ تین زرعی اصلاحات کے نتیجے میں بڑی بڑی جاگیریں ختم ہو چکی ہیں۔ اس کے لئے اکنامک سروے کے اعداد و شمار پیش کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ اس سروے میں صرف زرعی فارمز کی تعداد اور رقبے کے لحاظ سے ان کی درجہ بندی ظاہر کی گئی ہے یعنی تعداد مالکان' رقبہ خود کاشت ہے یا مزارعت پر اور فارم کا رقبہ دیا گیا ہے۔ لیکن یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ کسی ایک شخص یا خاندان کی ملکیت میں کتنے ایسے زرعی فارمز ہیں۔ لہٰذا اس سروے سے کسی شخص کی کل ملکیت کا اندازہ کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

زرعی اصلاحات کے نام پر تین مرتبہ یہاں جو ڈرامہ کیا گیا اس میں اول تو شروع سے ہی اتنی وسیع مراعات دے دی گئی تھیں کہ کوئی بنیادی تبدیلی آنے کا امکان نہ تھا۔ اس کے بعد اگر کوئی کام ہوا بھی تو وہ بالکل ناقص تھا۔ زمینوں کی منتقلی اور الاٹمنٹ یا تو محض خانہ پری کے طور پر کی گئی یا اصل مالکان نے مختار ناموں وغیرہ کے ذریعے اسے غیر موثر بنا دیا۔ چنانچہ بڑی بڑی جاگیریں سوائے معمولی ردوبدل کے جوں کی توں برقرار رہیں۔

عام کاشت کار کی حالت تو واقعی قابل رحم ہے کیونکہ اکثریت کے پاس گزارہ سے بھی کم رقبہ زیر کاشت ہوتا ہے لیکن ان زمینداروں کے وارے نیارے ہیں جن کے پاس درمیانے یا بڑے سائز کے فارمز ہیں۔ مناسب پیداوار حاصل کرنے کے لئے جہاں کم سے کم گزارہ کے لائق زرعی زمین کا ہونا ضروری ہے' وہیں اس کے لئے پانی کی فراہمی اور قرضوں کی سہولت ناگزیر ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں' مگر بڑے زمیندار اپنی معاشی اور سیاسی طاقت کے ذریعے چھوٹے کسانوں کو ان کے جائز حقوق سے بھی محروم رکھتے ہیں۔

اس مسئلے کا ایک دوسرا پہلو اکثر نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ ایک ہے جاگیرداری اور ایک ہے جاگیردارانہ ذہنیت۔ ایک جاگیردار کے پاس جو زمینیں ہیں وہ بڑی ہیں یا چھوٹی' وہ کس طرح سے حاصل کی گئیں' موجودہ حالات میں ان کی ملکیت جائز ہے یا نہیں' ملکی پیداوار میں اس سے کمی واقع ہوئی یا اضافہ ہوا؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام مسائل اپنی جگہ ہیں لیکن معاشرے پر ان کے مضر اثرات شاید اتنے نہ ہوں جتنا اس جاگیردارانہ ذہنیت نے معاشرے کو پراگندہ کیا ہے جو ہمارے ہاں پروان چڑھ کر آج ایک مستقل کلچر کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

یہاں کا جاگیردار اپنے آپ کو ایک الگ مخلوق تصور کرتا ہے اور اپنے سے کم تر ہر شخص کو کمی کا کمی قرار دینا اس کی سماجی اور سیاسی ضرورت ہے۔ یہ "کمی" لوگ مختلف خدمات سرانجام دیتے ہیں اور اپنے "مالک" کی "بڑائی" بیان کرتے ہیں۔ تاکہ جس کو وہاں رہنا ہے اس کی رعایا اور بے دام غلام بن کر رہے اور اس کا ہر حکم نہایت تابع رہ کر بجا لائے۔ جاگیردار کا اپنے آپ کو ہر قسم کے ملکی قوانین اور اخلاق و ضوابط سے بالاتر سمجھنا اس نظام کا جزو لازم ہے۔ اس کا حکم ہی قانون ہے اس لئے کہ قوانین ہمیشہ رعایا کے لئے ہوتے ہیں "معززین" کے لئے نہیں۔

ایک طویل عرصے سے کارفرما اس ذہنیت کا معاشرہ میں یہ اثر ہوا ہے کہ ایک طرف خود سر اور من مانی کرنے والا ایسا طبقہ وجود میں آگیا ہے جو اپنی بے پناہ سماجی اور سیاسی طاقت کے بل پر ملک میں سیاہ و سفید کا مالک بن گیا ہے اور دوسری طرف عوام کی اکثریت جی حضوری اور چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والوں پر مشتمل ہے جن کے نزدیک اچھے برے کی کوئی تمیز نہیں۔ اگر کوئی تمیز ہے تو آقا اور غلام کی۔ گویا ایک طرح سے عوام الناس حیوانی سطح پر زندگی گزار رہے ہیں۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ جس کے پاس بھی چار پیسے آتے گئے وہ جاگیردارانہ انداز اور ٹھاٹ باٹھ اختیار کر کے اپنے آپ کو "اشرافیہ" پر مشتمل حکمران طبقہ کی رفاقت حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگ گیا تاکہ نوازشات' مراعات اور الاٹمنٹوں کی بارش ان پر بھی ہونے لگے۔

پاکستان کے قیام کے وقت جو جاگیرداری نظام ہمیں ورثہ میں ملا اسے برطانوی راج کی معاونت کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ انگریز جس نے اس نظام کو پروان چڑھایا تھا اس کے پیش نظر اصلاً دو کام تھے۔ یعنی امن عامہ کا قیام اور سرکاری محصولات کی وصولی۔ اسے اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ معاشرہ پر اس کے کیا

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

گوشہ چمن

کیا تبدیلیوں کی آندھیاں چلنے والی ہیں؟

اس قوم کو سنبھلنے کے ان گنت مواقع ملے لیکن اس نے سارے مواقع ضائع کر دیئے !

اگر تبدیلی آئی تو اگلے عام انتخابات نوے دن میں نہیں بلکہ آئندہ صدی کے آغاز ہی میں ہو سکیں گے

نئی قیادت کیا تبدیلیاں لانے کا ارادہ رکھتی ہے؟ تحریک پاکستان کے ایک رہنما اور متوقع قائد سے ملاقات کا احوال

محمد بدر منیر

پاکستان میں ایک بار پھر تبدیلیوں کے آثار محسوس کئے جا رہے ہیں لیکن اس بار یہ تبدیلیاں مختلف طریقے سے آئیں گی۔ سوموار کی صبح کاذب کو مجھے ان تبدیلیوں کے ایک متوقع اہم کردار سے ملاقات کا موقع ملا۔ ان کو اور ان کے برادر خورد کو ایک طویل عرصے تک پاکستان کی سیاست میں اہم کردار ادا کرنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ تحریک پاکستان میں اپنے والد کے ساتھ ان دونوں بھائیوں نے بھی حصہ لیا' مسلم لیگ اور بعد ازاں ملک کے کئی اہم مناصب پر فائز رہے اور اب ایک بار پھر وہ ایک مرکزی کردار ادا کرنے کے لئے سرگرم ہیں۔ انہوں نے ملک کے اہم شہروں کا دورہ شروع کر دیا ہے اور اپنے دوستوں اور ہم خیالوں سے رابطے بھی قائم کر لئے ہیں' چند دوستوں سے تبادلہ خیال بھی ہو چکا ہے اور اب وہ وفاقی دار الحکومت کے علاوہ پشاور اور پھر کوئٹہ بھی جانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ہو سکتا ہے ان سطور کی اشاعت تک ان کا یہ دورہ مکمل ہو چکا ہو۔ انہوں نے راقم الحروف سے ملاقات کے دوران اس بات کی بالواسطہ طور پر تصدیق کی کہ انہیں اشارہ ملا ہے کہ وہ پاکستان کے لئے اہم خدمات انجام دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔ جب میں نے ان سے ڈاکٹر محبوب الحق' شاہد برکی اور شاہد حسن خان کے بارے میں کچھ تفصیلات دریافت کرنے کے لئے سوالات کئے تو انہوں نے جواب دیا۔ وقت آنے پر سب کے بارے میں پتہ چل جائے گا۔ جب میں نے نئے انتظامات میں جناب صدر کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے کہ فاروق اچھا بھلا آدمی ہے۔ ان سے چند باتیں آف دی ریکارڈ بھی ہوئیں۔ اس اعتماد کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ میرے ان سے مراسم ۱۹۵۴ء کے مشرقی پاکستان کے صوبائی انتخابات سے ہیں' اس کے بعد مشرقی پاکستان کی سیاست کے حوالے سے ان کے ساتھ مسلسل رابطہ رہا۔ ۱۹۷۰ء میں انہوں نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ "--- تم اپنے آپ کو علیحدہ کر لو --- سیاست کی غلاظت اب روح میں اترنے والی ہے"۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر لکھنے لکھانے تک خود کو محدود کر لیا۔ لیکن پھر بھی کچھ چنگاریاں میرے دامن اور میری قمیض کے کالر کو جلا گئیں۔

۲ ستمبر کی صبح کاذب کو لاہور چھاؤنی کے ایک آرام دہ اور گمنام ہوٹل کے کمرے میں ان سے ملاقات ہوئی تو وہ اپنی ضعیف العمری کے باوجود چاق و چوبند دکھائی دیئے۔

ان دنوں اخبارات میں متوقع تبدیلیوں کے بارے میں کئی پیشین گوئیاں کی جا رہی ہیں اور ان کی بنیاد پر بعض "پرندوں" نے آشیانے کی تبدیلی کے لئے بھی تیاریاں کر لی ہیں۔ حکومت اور اپوزیشن پارٹیوں کی کوئی تمیز نہیں۔ متعدد نامور حضرات نے لاہور چھاؤنی کے اس گمنام ہوٹل میں اپنے اپنے سیاسی اور سماجی مستقبل کی راہ تلاش کرنے اور اس پر چلنے کے لئے بعض اہم وعدے بھی کئے ہیں۔

جہاں تک میں نے اپنی ملاقات کی روشنی میں حالات کا تجزیہ کیا ہے اس بار تبدیلیاں ماضی کے مقابلے میں بہت مختلف ہوں گی۔ انتخابات نوے دن کے اندر نہیں ہوں گے بلکہ شاید اس صدی میں بھی نہ ہوں کہ انتخابات سے قبل سیاسی اور اقتصادی شعبے ہی میں نہیں بلکہ سماجی شعبے میں بھی اہم تبدیلیاں کی جائیں گی۔ انہیں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں بھی کہا جا سکتا ہے۔

- پاکستان کے تمام صوبوں کی از سر نو تشکیل و تدوین
- عام انتخابات کے لئے امیدواروں کی اہلیت کے ضابطوں میں اہم اصلاحات
- زمین کی ملکیت کی حدود اور شرائط میں انقلابی تبدیلیاں
- ایٹمی پالیسی اور کشمیر کے بارے میں ایک مضبوط قومی موقف
- تعلیمی نظام کو قومی امنگوں کے سانچے میں ڈھالنا' تمام ملک میں یکساں تعلیمی نظام' مڈل تک مفت تعلیم۔
- ٹیکسوں کے نظام میں وسیع تر اصلاحات
- نج کاری کے پروگرام میں انتہا پسندی کی بجائے اعتدال
- احتساب ہر سطح پر اور اس کے لئے ایک مستقل ادارے کا قیام
- ملک میں پارلیمانی کی بجائے صدارتی نظام کا نفاذ اور اسے ناقابل تبدیل بنانے کے لئے ایک "فول پروف" آئینی ضمانت کا حصول کہ اس کے بعد ہی عام انتخابات ممکن ہوں۔

مندرجہ بالا شخصیت کا اندازہ ہے کہ یہ سب کام چھ سال میں مکمل ہو سکے گا۔ اس دوران اگرچہ افراط زر کا خاتمہ نہیں ہو سکے گا لیکن اس کی شرح میں "استحکام" ہو جائے گا' زرعی پیداوار میں اضافے بلکہ خود کفیل ہونے کے لئے مثبت اقدامات کئے جا سکتے ہیں۔ ان صاحب کا پروگرام ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اپنے اصلاحی پروگرام کا اعلان کریں گے بلکہ اس کے ساتھ ہی اس پروگرام کی مرحلہ وار تکمیل کے لئے شیڈول بھی دیں گے۔

(باقی صفحہ ۲۲ پر)